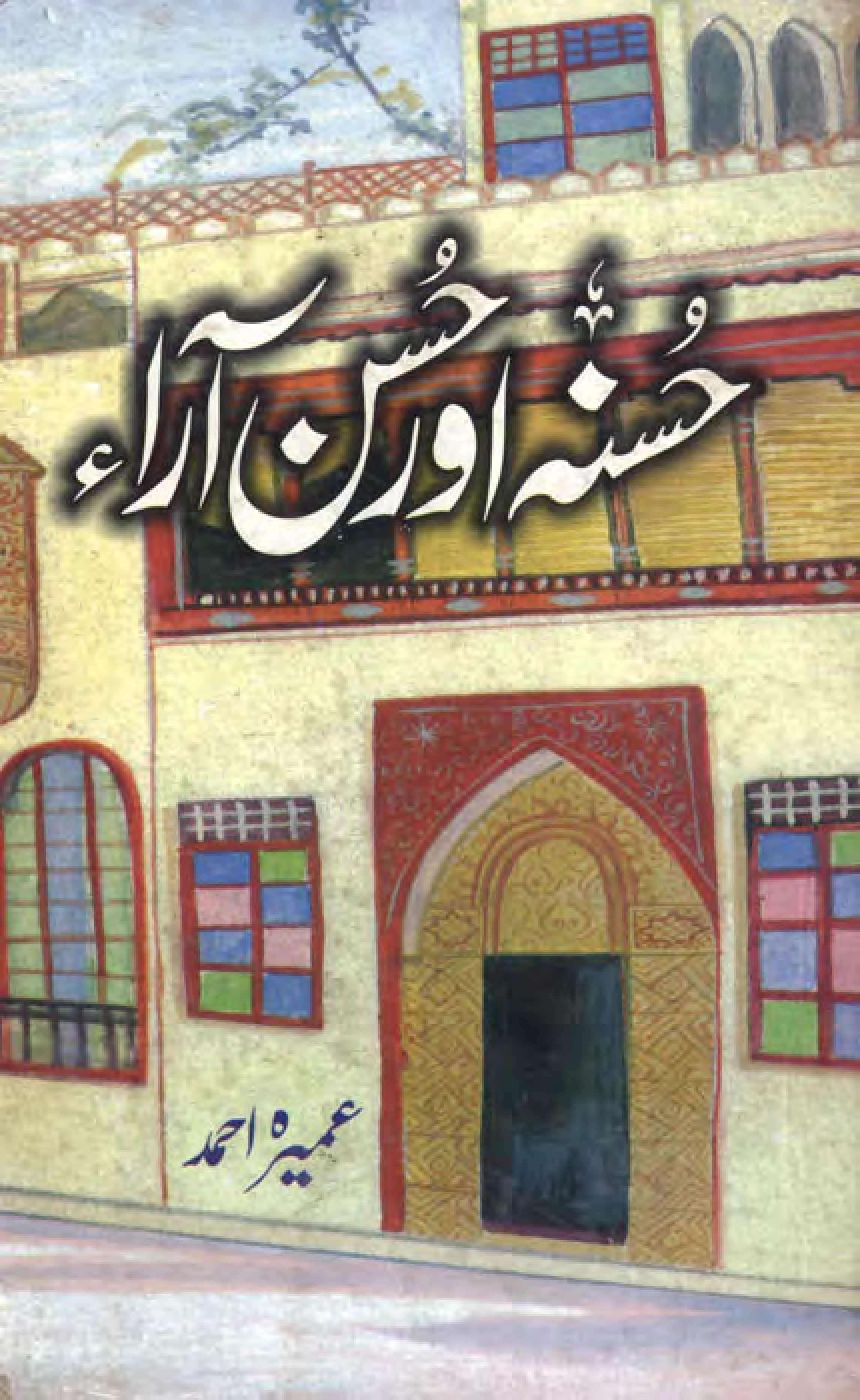
حسنہ اور حسن آراء
عمیرہ احمد

پیش لفظ

حُسنہ اور حُسن آراء میں میری چار تحریریں شامل ہیں۔ ان میں سے تین تحریریں ایسی ہیں جو ڈائجسٹ میں شائع شدہ ہیں مگر اب تک میں کتابی شکل میں آپ کے سامنے لانے سے گریزاں رہی۔ مگر ان تحریروں کو بالآخر کتابی شکل میں سامنے لانے کی وجہ میرے پبلشر اور قارئین کا اصرار تھا۔ یہ نہ ہوتا تو میں ان تحریروں کو ابھی بھی شائع نہ کرواتی۔

حُسنہ اور حُسن آراء میری دوسری ایسی تحریر ہے جو کسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے کی بجائے سیدھا ایک کتاب کا حصّہ بن رہی ہے۔ حُسنہ اور حُسن آراء میرا TV کے لئے پہلا منی سیریل بھی ہے اور یہ TV کی تاریخ کے مہنگے ترین منی سیریلز میں سے ایک ہے ...... اپنی تھیم کے لحاظ سے یہ آپ کو بہت متنازعہ لگے گا۔ مگر انسانی فطرت اس سے زیادہ حیران کُن اور متنازعہ ہے۔ مجھے یہ کہانی اس لئے پسند ہے کیونکہ میں نے پہلی بار کسی تحریر میں کسی پرانے دور کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسے لکھتے ہوئے کچھ مشکل اس لئے پیش آئی کیونکہ زبان کا انتخاب کرنے میں ذرا احتیاط کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ یہ میری اب تک کی واحد تحریر ہے جس میں انگلش کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں ہوا۔ میرے جیسے نئی نسل کے لکھنے والوں کے لئے ایسا کرنا بھی بہت مشکل ہے۔

اور آخر میں ایک بات۔ میرا تعلق پاپولر فکشن لکھنے والوں میں سے ہے اور میری خواہش ہے کہ میری تحریروں کو اُسی Genre کے معیار کے مطابق Judge کیا جائے۔ میری تحریروں کو ادب سمجھ کر اُس کے ادبی محاسن اور نقائص پر بحث نہ کی جائے۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لئے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔ اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ میں میری کتابوں کے حقوقِ اشاعت حاصل کرنے کے بعد علم و عرفان پبلشر نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

عمیرہ احمد

حُسنہ اور حُسن آراء

"بس میں کہتی ہوں بوا حُسنہ کا بوجھ سر سے اُترے تو میں اور صوفی صاحب بھی حج کو نکلیں"۔

دل شاد نے سروتے سے چھالیہ کترتے ہوئے ایک گہرا سانس لے کر بوا سے کہا جو اُس کے پاس ہی صحن کے تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"میں تو اپنی سی کر رہی ہوں دلشاد ...... شہر کا ہر اچھا رشتہ لیکر تمہارے گھر آئی..... مگر بس حُسنہ کی قسمت"۔

بوا نے بھی ایک گہرا سانس لیا اور پھر پان منہ میں رکھ لیا۔

"ٹھیک کہا تم نے بوا ...... یہ ساری قسمت کی بات ہوتی ہے مگر یہ تم ساتھ والے اکبر میاں کی ماں سے بات کیوں نہیں کرتی"۔

دلشاد نے بالآخر اُن سے اپنے دل کی بات کہی۔ "ارے اکبر میاں کی ماں سے تو پہلے ہی پوچھ چکی ہوں میں"۔ بوا نے بے حد ناگواری سے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ "ایک آفت کی پرکالہ ہے اُس کی ماں ...... کہنے لگی ہم ہمسایوں میں شادی نہ کریں گے بیٹے کی ...... بہو سارا دن اپنی ماں کے گھر گھسی رہے گی۔ ہمیں تو بوا دوسرے شہر کا رشتہ دکھاؤ تا کہ بہو مہینوں کے بعد اپنے میکے کا رُخ کرے۔

بوا نے اکبر کی ماں کی نقل اُتارتے ہوئے کہا

"پھر بھی بوا..... تم ایک بار پھر بات کرو..... شکل و صورت اچھی ہے لڑکے کی ...... چال چلن بھی اچھا ہے..... اوپر سے پوری جائیداد کا اکلوتا وارث ...... نہ بہن نہ بھائی

...... یہ رشتہ ہو گیا تو میری حُسنہ تو راج کرے گی راج''۔

دلشاد نے کہا ''تم کہتی ہو تو ایک بار پھر بات کرتی ہوں ...... مگر ایمان سے کہتی ہوں بیٹے کو بوڑھا کر کے دم لے گی یہ عورت ...... سو سو نقص نکالتی ہے ہر لڑکی میں''۔

''پر میری حُسنہ کی تو ہمیشہ ہی تعریف کی اُس نے''۔ دلشاد نے بے ساختہ کہا۔

''منہ پر تو تعریفیں ہی کرتی ہے ...... اصل چھری تو پیٹھ پیچھے پھیرتی ہے ...... پر خیر اب تم نے کہا ہے تو بات تو کرنی ہی پڑے گی ......

یہ صوفی صاحب نظر نہیں آ رہے گھر پر؟ بوا نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے یک دم موضوع بدلا۔

''ہاں نماز پڑھنے نکلے ہیں۔ دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' اللہ سلامت رکھے صوفی صاحب کو ...... لاکھوں میں ایک ہیں ...... سر کا تاج بنا کر رکھا ہے انہوں نے تمہیں۔

''بوا نے بے حد فیاضی سے صوفی صاحب کی تعریف کی''۔ بے شک بوا ...... ایسا میاں تو قسمت والی عورتوں کو ملتا ہے ...... میں تو خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی''۔

''دلشاد نے بھی بے ساختہ صوفی صاحب کی تعریف کی''۔

بے شک ...... بے شک ...... ورنہ بیٹا نہ ہو تو میاں تو طعنے دے دے کر مار دیتے ہیں ...... وہ نہ ہو تو دوسری شادی کر لیتے ہیں ...... واقعی فرشتہ صفت آدمی ہیں صوفی صاحب ...... اے پورے محلے میں ان جیسا آدمی نہیں ...... اچھا دلشاد میں چلتی ہوں اب ...... جلد ہی کوئی اچھی خبر لے کر آؤں گی''۔

''بوا نے بالآخر پان کی ایک اور گلوری اُٹھاتے ہوئے کہا اور سلام کر کے دروازے کی طرف چل پڑی۔

دلشاد ایک گہرا سانس لے کر ایک بار پھر چھالیہ کترنے لگی تھی مگر اُس کا ذہن بوا کی باتوں میں اٹکا ہوا تھا۔ حُسنہ 20 سال کی ہونے کو آئی تھی اور ابھی تک اُس کی کہیں شادی طے نہیں ہو پا رہی تھی۔

یہ دلشاد بیگم اور صوفی صاحب کے لئے بے حد پریشان کن بات تھی۔ خاندان کی ہر لڑکی سولہویں سترھویں سال میں بیاہی جا چکی تھی اور حُسنہ اب خاندان میں واحد لڑکی تھی جس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی ...... بظاہر اُس کی شادی نہ ہونے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ حُسنہ خوبصورت تھی۔ سگھڑ اور سلیقہ مند تھی پھر صوفی صاحب کی اکلوتی اولاد تھی۔ بے حد حسب نسب والے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ...... اس کے باوجود اُس کا رشتہ ابھی تک نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اُس کے لئے رشتے ہی نہ آتے ہوں ...... اچھے اچھے خاندانوں سے حُسنہ کے لئے رشتے آتے رہے مگر شروع میں دلشاد بیگم اور صوفی صاحب ضرورت سے زیادہ چھان بین کرتے رہے۔

بعد میں یہ کام لڑکے والوں نے کرنا شروع کر دیا۔ 60 اور 70 کی دہائی میں بھی ان جیسے قدامت پرست گھرانوں میں بہت ساری چیزیں قابل اعتراض سمجھی جاتی تھیں۔ کئی گھرانوں کو حُسنہ کے اکلوتے ہونے پر اعتراض تھا کیونکہ اُنہیں لگتا ماں باپ نے حُسنہ کے ناز نخرے اُٹھا کر اُسے بگاڑ دیا ہوگا۔

کچھ گھرانوں کا خیال تھا کہ صوفی صاحب کو بیٹی کو قرآن کی تعلیم کے علاوہ سکول کی تعلیم بھی دینی چاہیے تھی کیونکہ حُسنہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ بعض گھرانوں کو صوفی صاحب کے گھرانے کے رکھ رکھاؤ پر اعتراض ہوتا۔ جہاں گھر سے باہر اب بھی عورتیں ٹوپی والا بُرقعہ پہن کر نکلتی تھیں اور بعض گھرانوں کو دولت مند ہونے کے باوجود اُن کے بے حد سادہ طرز زندگی پر ......

زمانہ بدل رہا تھا مگر کم از کم اس کی کوئی جھلک بلند اقبال المعروف صوفی صاحب کے گھر نظر نہیں آتی تھی۔ وہ منڈی میں ایک بڑے آڑھتی تھے۔ آباؤ اجداد یہی کام کرتے آ رہے تھے اور انہوں نے کبھی اس سے ہٹ کر کچھ اور کرنے کا نہیں سوچا تھا ...... جو اضافی کام پچھلے کچھ سالوں میں وہ کرنے لگے تھے۔ وہ مسجد میں امامت کا تھا۔ امام صاحب کے نہ ہونے پر اکثر صوفی صاحب کو ہی محلے کی مسجد میں امامت کے لئے کھڑا کر دیا جاتا تھا اور وہ اسے جیسے اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہوئے کرتے تھے۔ نیک

شریف اور کھلے دل سے خیرات کرنے والے آدمی تھے محلے میں کوئی ایسا نہیں تھا جسے صوفی صاحب سے کبھی کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔

کچھ ایسا ہی حال دلشاد بیگم کا تھا۔ صوفی صاحب کی طرح وہ بھی ایک بہت اونچے اور بارسوخ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ صوفی صاحب سے اُن کی شادی سترہ سال کی عمر میں ہوئی تھی اور دونوں میاں بیوی میں کمال کی محبت تھی۔ دلشاد بیگم میں 17 سال کی عمر میں بھی 40 سال کی عمر کی عورتوں والا رکھ رکھاؤ تھا۔ وہ نوکروں سے بھرے پرے گھر سے صوفی صاحب کے گھر میں آئی تھیں جہاں صوفی صاحب اور اُن کے ماں باپ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ صوفی صاحب کے خاندان میں زیادہ ملازم رکھنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ گھر کی بہوؤں کو خود ہی کام کرنا ہوتا تھا اور دلشاد بیگم نے پہلے دن سے ماتھے پر ایک شکن لائے بغیر اس گھر کے طریقوں کو یوں اپنا لیا تھا کہ شادی کے پندرہ سال بعد جب وقفے وقفے سے اُن کے ساس سُسر کا انتقال ہوا تو اُن کے ہونٹوں پر دلشاد کے گُنوں کے ہی قصیدے تھے۔

دلشاد کو اپنے خاندانی ہونے پر جتنا ناز تھا صوفی صاحب کی چہیتی بیوی ہونے پر اُس سے زیادہ فخر...... صوفی صاحب واقعی دلشاد پر جان چھڑکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کے پندرہ سال گزر جانے پر بھی کوئی اولاد نہ ہونے اور ہر ایک کے اصرار حتیٰ کہ دلشاد کے اجازت دے دینے پر بھی انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ حُسنہ پندرہ سال کے بعد اُن کے ہاں پیدا ہوئی تھی اور حُسنہ کی پیدائش کے بعد دلشاد کے ہاں دوبارہ کبھی اولاد نہیں ہوئی۔...... صوفی صاحب نے شادی کے 35 سال میں دلشاد کو کبھی ایک بار بھی یہ چیز بتائی نہیں اور بدلے میں دلشاد نے بھی صوفی صاحب کی جی جان سے خدمت کی۔ صوفی صاحب نے اگر دن کو رات کہا تو دلشاد کے لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اُسے رات نہ کہتی۔ اپنے خاندان کی عورتوں کی طرح وہ اطاعت ' فرمانبرداری اور رکھ رکھاؤ میں اپنی مثال آپ تھی ...... اور اس بات کو ماننے اور سراہنے والے میکے ' سسرال اور محلے میں دلشاد کو بہت لوگ ملے ...... یہی سارے گُن دلشاد نے حُسنہ کو بھی دیئے تھے اور

اسے اس بات پر بڑا ناز تھا کہ اُس کی بیٹی جیسی خاندانی لڑکی اب کہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی۔

اس کے باوجود پریشانی یہ تھی کہ حُسنہ ابھی تک ماں باپ کے گھر بیٹھی تھی اور حُسنہ کی پریشانی وہ واحد غم تھا جو ان دونوں کو ان دنوں لاحق تھا۔ حُسنہ خود بھی ان دنوں بے حد اُداس اور چپ رہنے لگی تھی اور اُس کی یہ حالت دلشاد اور صوفی صاحب کو مزید فکر مند کرتی تھی۔ ...... وہ اُن کی لاڈلی اکلوتی بیٹی تھی آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ حُسنہ کو کوئی کمی ہوئی اُس کی کوئی فرمائش پوری نہ ہوئی ہو...... مگر اب ...... اب جو کچھ ہو رہا تھا اُس پر نہ دلشاد بیگم کا اختیار تھا نہ صوفی کا ...... کوشش اور دُعا کے علاوہ وہ دونوں کچھ نہیں کر سکتے تھے اور یہ کام وہ دونوں سالوں سے کرتے آ رہے تھے۔

''تمہارے ابا ابھی تک نہیں آئے ...... اللہ خیر کرے''۔ دلشاد نے بے حد بے تابی سے صحن میں ٹہلتے ہوئے بے حد پریشانی سے حُسنہ سے بولی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی کمرے سے نکلی تھی۔ ''اماں نماز پڑھنے گئے ہیں مسجد میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے''۔

حُسنہ نے قدرے لاپرواہی سے ماں کو تسلی دی''۔ اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوئی۔ دلشاد کی بے تابی میں کمی نہیں آئی۔

''مولوی صاحب کے پاس بیٹھ گئے ہوں گے آپ جانتے تو ہیں ابا کی عادت کو''۔

''پھر بھی اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوتی''۔

اس سے پہلے کہ دلشاد کچھ اور کہتی صحن کے بیرونی دروازے پر بے حد شناسا دستک ہوئی۔

''یہ لیں آ گئے ابا ...... میں کہہ رہی تھی نا کہ آپ خوامخواہ فکر کر رہی ہیں''۔

حُسنہ نے صحن کے نلکے سے صراحی کو بھر کر اندر برآمدے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''اس عمر میں اسی طرح فکر ہوتی ہے ...... تم جا کر کھانا لگاؤ''۔

دلشاد نے مسکرا کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"آج تو بہت دیر لگا دی آپ نے ...... میں پریشان ہوگئی تھی کہاں رہ ......"

دروازہ کھولتے ہوئے دلشاد نے کہنا شروع کیا اور پھر اُس کا جملہ اُس کے منہ میں ہی رہ گیا۔صوفی صاحب کے عقب میں ایک برقعہ پوش لڑکی کھڑی تھی۔

"آؤ اندر آ جاؤ حُسن آراء۔صوفی صاحب نے دلشاد سے نظریں چراتے ہوئے اُس لڑکی سے کہا۔ برآمدے کی طرف صراحی لے جاتی ہوئی حُسنہ نے پلٹ کر باپ کو دیکھا اور قدرے حیرانی کے عالم میں رُک گئی۔ دلشاد نے بھی بے حد حیرانی سے باری باری صوفی صاحب اور اُس لڑکی کو دیکھا جو اپنے چہرے کو نقاب میں چھپائے بے حد سلیقے سے اُنہیں آداب کہہ رہی تھی۔ دلشاد نے اُس کے انداز اور مہندی کے نقش و نگار سے سجے اُس کے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھا پھر کچھ نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں آداب کہتے ہوئے اُس نے صوفی صاحب کو دیکھا جو اب دروازہ بند کر رہے تھے۔ حُسنہ اسی طرح دور برآمدے میں صراحی لئے دلچسپی سے اس سارے منظر کو دیکھ رہی تھی۔

"حُسن آراء یہ دلشاد ہے ...... اور دلشاد یہ حُسن آراء ہے۔صوفی صاحب نے مدھم آواز میں اُن دونوں کو ایک دوسرے سے جیسے متعارف کروایا"۔

"میں نے پہچانا نہیں"۔

دلشاد نے مسکرا کر قدرے اُلجھے انداز میں حُسن آراء کو دیکھا۔

"یہ میری دوسری بیوی ہے"۔ صوفی صاحب نے قدرے جھجک کر دور برآمدے میں کھڑی حُسنہ کو دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔مگر وہ آواز کسی کے لئے بھی اتنی مدھم نہیں تھی کہ سُنی نہ جا سکے۔ حُسنہ کے ہاتھ سے صراحی چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ حُسن آراء چونک کر اُس کی طرف متوجہ ہوئی۔ جبکہ دلشاد دونوں ہاتھ سینے پر رکھے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ صوفی صاحب کو دیکھ رہی تھی ...... کیا بے یقینی سی بے یقینی تھی ......

دوسری بیوی؟

"حُسنہ انہیں اوپری منزل پر لے جاؤ ...... مہمان خانے میں ...... کل ایک کمرہ

ٹھیک کر دینا ان کے لئے۔صوفی صاحب نے دلشاد سے نظریں چراتے ہوئے دور کھڑی حُسنہ سے کہا۔جس نے بے حد شکایتی نظروں سے باپ کو دیکھا اور پھر ایک لفظ کہے بغیر اندر چل پڑی۔

"جائیں حُسن آراء" صوفی صاحب نے اُس سے کہا۔ دلشاد ابھی بھی پتھر کے مجسمے کی طرح وہیں دروازے پر کھڑی تھی۔ صوفی صاحب کا 35 سال میں تراشا جانے والا بُت دو سیکنڈز میں زمین پر گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔

حُسن آراء نے ایک بار پھر دلشاد کو دیکھا اور پھر اندر چلی گئی۔ "کھانا لگاؤ"۔ صوفی صاحب نے دلشاد سے نظریں چراتے ہوئے کہا اور خود بھی سر سے ٹوپی اُتارتے ہوئے اندر چلے گئے۔

دلشاد وہیں کھڑی اُنہیں جاتا دیکھتی رہی۔ "دوسری بیوی ...... حُسن آراء ......" اُس کا ذہن ابھی تک ان الفاظ کی گونج سے لرز رہا تھا۔

آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ یوں اچانک ایک رات صوفی صاحب ایک دوسری عورت کو بیوی بنا کر گھر لے آئیں ...... اُن سے بات کرتے۔ اُن سے پوچھتے، اُن کو بتاتے ...... یا اور کچھ نہیں تو اپنی کسی حرکت سے دلشاد کو شُبہ کرنے پر ہی مجبور کر دیتے ...... کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا ...... وہ سیدھے سیدھے ایک بیوی لے آئے تھے ...... ایک بیوی ...... دلشاد کی آنکھوں میں سیلاب کی طرح پانی اُمڈا تھا ...... اُس گھر میں 35 سال کی شادی شدہ زندگی میں پہلی بار صوفی صاحب نے اُنہیں رُلایا تھا۔

"یہ ہے مہمان خانہ"۔ حُسنہ نے بے حد تیکھے تیوروں کے ساتھ اپنے پیچھے کمرے میں داخل ہوتی حُسن آراء سے کہا۔ جس نے یک دم اپنے چہرے سے نقاب ہٹا لیا۔ حُسنہ کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ بے حد حسین نین ونقوش کی تقریباً اُس کی ہم عمر ایک لڑکی تھی۔ باپ سے گلہ کچھ اور بڑھ گیا۔

"ایک گلاس پانی ملے گا؟" حُسن آراء نے بے حد سُریلی آواز میں مسکراتے ہوئے حُسنہ کو مخاطب کیا۔ وہ کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ

پانی کا گلاس لیکر کمرے میں داخل ہوئی تو اُسے ایک جھٹکا اور لگا تھا۔ حُسن آراء اب اپنا برقع اُتار کر پلنگ پر رکھ چکی تھی وہ بے حد چست قمیض اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھی۔ ”اور ابا نے آج تک مجھے کبھی چوڑی دار پاجامہ پہننے نہیں دیا“۔ حُسنہ نے بے حد سرکشی سے سوچا۔

”پانی کا گلاس اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے حُسنہ نے حُسن آرا کو ایک بار پھر بے حد تنقیدی نظروں سے سر سے پاؤں تک دیکھا“۔ آخر ابا کو ایسی خوبصورت لڑکی کہاں سے ملی ہوگی؟

”شکریہ...... مجھے کپڑوں کا ایک جوڑا مل سکتا ہے۔ حُسن آراء نے ایک بار پھر پانی کا خالی گلاس اُسے واپس تھماتے ہوئے اُس کے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا۔

”جو بھی چاہیے ایک دفعہ کہیے...... میں ملازمہ نہیں ہوں کہ بار بار چکر کاٹتی پھروں۔“ اس دفعہ حُسنہ نے بے حد تلخی سے اُس سے کہا۔

”بس اور کچھ نہیں چاہیے...... کپڑوں کا ایک جوڑا۔ حُسن آرا نے بے حد تحمل سے کہا۔ حُسنہ اُسے گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

حُسن آراء نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا پھر کمرے کی اکلوتی کھڑکی کو کھول کر باہر جھانکنے لگی۔

تبھی حُسنہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ہاتھ میں پکڑا جوڑا پلنگ پر پھینکتے ہوئے وہ کھڑکی کے پاس آئی اور بے حد تلخی سے کھڑکی کے پٹ بند کرتے ہوئے بولی۔

”ہمارے گھر کی عورتیں کھڑکیوں میں کھڑی نہیں ہوتیں...... وہ بھی رات کے اس وقت۔

حُسن آراء اُس کی بات پر یک دم سُرخ چہرے کے ساتھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

”مجھے پتہ نہیں تھا“۔ حُسنہ نے اُس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے اُسے بے حد عجیب نظروں سے دیکھا پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اماں یہ ابا نے کیا کیا؟

”دلشاد نے بے اختیار اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کیے وہ تب سے صحن

کے تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اندر جانے کی ہمت ہی نہیں ہو پا رہی تھی ...... صوفی صاحب کا اور اُن سے بھی بڑھ کر اُس عورت کا دوبارہ سامنا......

”دسترخوان لگایا تم نے۔ انہوں نے حُسنہ کے سوال کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے بے حد مستحکم آواز میں حُسنہ سے کہا جو اُن کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

”اماں آپ نے اُس کو دیکھا نہیں...... اُس کی عمر میرے جتنی ہوگی......“

دلشاد نے چونک کر حُسنہ کو دیکھا۔ اُن کے دل پر جیسے ایک اور گھونسہ پڑا۔

”آخر ابا کو اس عمر میں ہو کیا گیا۔ فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے ...... جا کر دسترخوان لگاؤ تمہارے ابا کو بھوک لگ رہی ہوگی“۔

حُسنہ نے حیران ہو کر ماں کو دیکھا۔ یہ وہ ردعمل نہیں تھا جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ دلشاد اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ وہ جانتی تھی وہ وہاں کھڑی رہے گی تو حُسنہ کے سوال و جواب بھی جاری رہیں گے اور جو کچھ بھی تھا وہ بہرحال حُسنہ کو اس معاملے میں دخل انداز نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

حُسنہ نے اتنی آسانی سے اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ باورچی خانے میں دلشاد کے پیچھے آئی۔

”آپ ابا سے بات کریں“۔

”کیا بات کروں؟“

دلشاد نے بے حد سپاٹ انداز میں چپاتیاں بنانے کے لئے توا رکھتے ہوئے کہا۔

”اُن سے پوچھیں انہوں نے اس عمر میں کیا سوچ کر شادی......“

لیکن دلشاد نے سختی سے حُسنہ کی بات کاٹ دی۔

”یہ میری اور تمہارے ابا کی بات ہے اور مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے...... سالن گرم کرو“۔ حُسنہ نم آنکھوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے سالن کی ہنڈیا دوسرے چولہے پر چڑھانے لگی۔

اُس رات پہلی بار دلشاد نے کئی چپاتیاں بنائیں۔ کئی جلائیں...... حُسنہ کھانے

کے برتن اندر دسترخوان پر لے جاتی رہی اور یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔

ماں کو ساری عمر ایک خاندانی عورت کی طرح اُس نے اُسی رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کرتے دیکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر واویلا مچا دینا یہ خاندانی عورتوں کا وطیرہ نہیں تھا اور دلشاد بیگم بھی اس وقت اسی رکھ رکھاؤ کا ثبوت دے رہی تھیں۔

''اب آپ آجائیں برتن لگا دیئے میں نے۔''

حُسنہ نے چپاتیوں کی چنگیر اندر لے جاتے ہوئے اس بار دلشاد سے کہا۔ دلشاد کا جی چاہا کہے۔ اُس کی تو ساری عمر کے لئے بھوک ختم ہوگئی آج کے بعد سے

''تم چلو میں آتی ہوں''۔ اُس نے حُسنہ سے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

جس وقت وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی صوفی صاحب بھی تقریباً اُسی وقت اندر آئے۔ دسترخوان پر ایک نظر ڈالتے ہی انہوں نے قدرے خفگی کے انداز میں حُسنہ سے کہا۔

''حُسن آراء کے لئے برتن رکھنا بھول گئی حُسنہ ...... یاد رکھو...... اب اس گھر میں چار لوگ رہتے ہیں''۔

حُسنہ نے باپ کی جھڑکی پر ایک نظر دلشاد کو دیکھا۔ جو سپاٹ چہرے کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ رہی تھی۔

''جی''۔

پھر اُس نے مدھم آواز میں باپ سے کہا اور حُسن آراء کے لئے بھی برتن رکھنے لگی۔

''جاؤ چھوٹی امی کو بُلا لاؤ''۔

دلشاد کے دل پر جیسے کسی نے آرا چلایا تھا۔ کچھ یہی حال حُسنہ کا ہوا تھا صوفی صاحب حد کر رہے تھے۔ گھر کے بٹوارے کے ساتھ ساتھ اکلوتی اولاد کے ساتھ رشتے کا بھی بٹوارہ کر رہے تھے۔

حُسنہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے باپ کو دیکھا جو دسترخوان پر بیٹھ رہے تھے اور

پھر اُٹھ کر حُسن آرا کو بلانے کے لئے چلی گئی۔

حُسن آراء اُس کے کپڑے پہنے پلنگ پر نیم دراز تھی۔ ''ابا کھانے کے لئے بلا رہے ہیں''۔ حُسنہ نے بلند آواز میں بے حد بے زاری سے اعلان کیا۔ حُسن آراء چونک کر اُس کی طرف متوجہ ہوئی۔ پھر اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے لاپرواہی سے دوپٹہ گلے میں ڈالا اور اس کے ساتھ چلنے لگی۔

حُسنہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''ابا کے سامنے اس طرح جائیں گی؟''

اُس کا اشارہ جس طرف تھا حُسن آراء سمجھ گئی تھی قدرے نادم ہو کر اُس نے جیسے دوپٹہ سر پر لٹکانے کی کوشش کی اور پھر حُسنہ سے کہا۔

''تمہارے کپڑے ٹھیک سے سلے نہیں...... بہت زیادہ کھلے ہیں''۔

''ہمارے گھر میں عورتیں ایسے ہی کپڑے پہنتی ہیں...... آپ کے اپنے کپڑے بہت تنگ ہیں یا پھر چھوٹے ہو گئے ہیں آپ کو''۔

حُسنہ نے اُس پر جملہ کسا اور پھر حُسن آراء کا ردعمل دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔

حُسن آراء چند لمحے کھڑی کی کھڑی رہ گئی پھر جیسے اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آئی اور وہ باہر نکل آئی۔ جس وقت وہ کھانے کے کمرے میں پہنچی۔ دلشاد اور حُسنہ کھانا کھا رہی تھیں جبکہ صوفی صاحب اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

''آؤ...... آؤ حُسن آراء...... ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے''۔

صوفی صاحب نے ایسے ظاہر کیا جیسے وہاں بیٹھے سب لوگ حُسن آراء کے منتظر تھے۔ حُسنہ نے ایک بار پھر بڑی ناراضگی سے دلشاد کو دیکھا جو بظاہر کھانے کی طرف متوجہ تھی مگر حُسن آرا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس پر پڑنے والی ایک نظر ہی گویا اُس کے دل کا خون کر گئی تھی۔ وہ واقعی حُسنہ کی عمر کی تھی اور بلا کی حسین تھی۔ صوفی صاحب کے بُت کے کچھ اور ٹکڑے ہو گئے تھے۔

صوفی صاحب نے حُسن آراء کو کھانا نکال کر دیا تو دلشاد کا رنج اور بڑھا۔ یہ کام صوفی صاحب پہلے صرف اُس کے اور حُسنہ کے لئے کرتے تھے آج اُن دونوں نے

خود کھانا لے لیا تھا اور صوفی صاحب ایک دوسری عورت پر یہ نوازش کر رہے تھے۔

کھانا کھاتے کھاتے صوفی صاحب کو ہچکی آئی۔ اس سے پہلے کہ دلشاد یا حُسنہ کچھ کرتی۔ حُسن آراء نے برق رفتاری سے پانی کا گلاس اُٹھا کر صوفی صاحب کو دیا اور بسم اللہ کہتے ہوئے اُن کی پشت کو تھپکا۔ صوفی صاحب نے قدرے خجل ہوتے ہوئے پانی پیتے ہوئے چور نظروں سے دلشاد اور حُسنہ کو دیکھا جو یوں ظاہر کر رہی تھیں جیسے وہ یہ سب کچھ نہیں دیکھ رہی تھیں۔

''اور پانی دوں صوفی صاحب''۔ حُسن آراء نے بڑے انداز سے صوفی صاحب سے کہا۔ دلشاد اور حُسنہ نے بے اختیار نظریں اُٹھا کر حُسن آراء کو دیکھا مگر وہ مکمل طور پر صوفی صاحب کی طرف متوجہ تھی۔

''نہیں تم کھانا کھاؤ''۔ صوفی صاحب نے اُسے نرمی سے منع کیا۔ حُسن آراء نے یک دم ایک لقمہ توڑا اور صوفی صاحب کے منہ کے سامنے کر دیا۔ دلشاد اور حُسنہ کے ساتھ ساتھ اس بار صوفی صاحب بھی ہکا بکا رہ گئے تھے۔ اس بار دلشاد برداشت نہیں کر سکی تھی۔ اپنی پلیٹ کو ایک طرف کرتے ہوئے وہ تیزی سے دسترخوان سے اُٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ حُسنہ نے بھی یہی کیا۔ حُسن آراء چونک کر اُن دونوں کی طرف متوجہ ہوئی پھر اُس نے کچھ نادم ہو کر وہ لقمہ نیچے پلیٹ میں رکھ دیا۔

''کل حُسن آرا کے لئے گھر کا ایک کمرہ ٹھیک کروا دینا...... اپنے ساتھ بازار لے جا کر اُسے کچھ کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان بھی خرید دینا''۔

صوفی کھانے کے بعد بہت جلد ہی اندر اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ انہوں نے دلشاد سے کھانا چھوڑنے کی وجہ پوچھنے کے بجائے الماری کھول کر اپنے کپڑے نکالتے ہوئے اُسے کچھ ہدایات دیں''۔

''کیوں؟ میں اُس کی ملازمہ ہوں؟''

دلشاد یک دم بھڑک اُٹھی۔

''میں نے ایسا کب کہا؟''

صوفی صاحب نے حیران ہوتے ہوئے اُسے دیکھا۔ ''اگر آپ اُسے بیاہ کر گھر لا سکتے ہیں تو بازار جا کر خریداری بھی کروا سکتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے میں کروا دوں گا''۔

صوفی صاحب نے جیسے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔ وہ الماری سے ایک بار پھر اپنے کپڑے ڈھونڈنے لگے۔ دلشاد کچھ دیر خاموشی سے اُن سے کسی بات کی توقع کرتی رہی۔ پھر اُس نے بے حد رنج سے صوفی صاحب سے کہا۔

''میری خدمت میں ایسی کیا کمی رہ گئی حُسنہ کے ابا کہ آپ نے اس بڑھاپے میں میرے سر پر سوکن لا بٹھائی؟''

''ایسی باتیں مت کرو دلشاد...... میں نے کب کہا کہ تمہاری خدمت میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ میرا اور حُسن آراء کا جوڑ بس قسمت میں تھا اس لئے وہ اس گھر میں آ گئی''۔

صوفی صاحب نے پلنگ پر دلشادؔ کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ ''عشا'' پڑھنے گئے اور میرے لئے ''سوکن'' لے کر آ گئے''۔

دلشاد نے جیسے تڑپ کر کہا۔

''تم خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ میں دوسری شادی کر لوں...... کتنا اصرار کیا تھا تم نے...... یاد ہے تمہیں؟''۔

''کئی سال پہلے کی بات ہے وہ اور تب تو آپ نے میری بات مان کر نہ کی اور اب......

صوفی صاحب نے دلشاد کی بات کاٹی''۔

''تب نہ سہی اب سہی مگر بات تو مان لی نا میں نے تمہاری''۔

''شادی ہی کرنا تھی تو کسی بڑی عمر کی عورت سے کرتے اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کو بیاہ لائے...... محلے والوں کو پتہ چلے گا تو کیا کہیں گے وہ؟''

''کچھ نہیں کہیں گے...... چار دن باتیں کریں گے پھر خاموش ہو جائیں

گے"۔

صوفی صاحب کے پاس جیسے ہر اعتراض کا جواب تھا۔

"پر اُسے لائے کہاں سے آپ؟ ...... کس خاندان کی ہے؟"

دلشاد کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اُن سے اور کیا کہے۔

"یہ سوال غیر ضروری ہیں ...... وہ اس گھر میں آ گئی اب یہ اُس کا گھر اور ہم سب اُس کا خاندان ...... باقی سب کچھ بھول جاؤ"۔

اس بار صوفی صاحب کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

"بھولوں تو تب جب اُس کے بارے میں کچھ پتہ چلے ...... آپ تو اس طرح دیوانے ہوئے بیٹھے ہیں اُس کے کہ اُس کے بارے میں زبان کھول کر نہیں دے رہے"۔

دلشاد کو اُن کا لہجہ چبھا اور صوفی صاحب کو اُن کا جملہ۔

"مجھ سے جو کہنا ہے کہہ لو لیکن حُسن آراء سے اس طرح کے سوال جواب کرنے مت بیٹھنا ...... اس گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں چاہیے مجھے ...... وہ تمہاری عزت کرے گی اور تم اُسے چھوٹی بہنوں کی طرح رکھنا ...... دروازہ بند کر لو ......"

صوفی صاحب اُٹھ کر کمرے سے چلے گئے۔ دلشاد بے اختیار اُن کے پیچھے کمرے کے دروازے تک گئی ...... چند گھنٹوں میں وہ ایک معزول بادشاہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں ...... چند گھنٹوں میں 35 سال کا ساتھی بدل گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کرنے کی بجائے وہ واپس اپنے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئیں اور دوپٹہ آنکھوں پر رکھ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ خاندانی عورت تھیں صوفی صاحب سے یہ کیسے کہتیں کہ اُنہیں اُن سے شدید محبت تھی ...... 35 سال پر محیط محبت اور یہ گھر ہاتھ سے جانے کا دُکھ نہیں تھا یہ صوفی صاحب کے دل میں کسی اور کے آ جانے کا دُکھ تھا جو اُنہیں چھکوں پھکوں رُلا رہا تھا۔

اگلے دن کا آغاز بے حد خاموشی سے ہوا تھا۔ صوفی صاحب کو ہمیشہ کی طرح دلشاد بیگم نے ہی ناشتہ تیار کر کے دیا۔ صوفی صاحب دلشاد کی سُرخ سوجی ہوئی آنکھوں سے نظریں چراتے ہوئے اکیلے ناشتہ کرتے رہے۔ پھر ناشتہ ختم کرنے کے بعد انہوں نے اُٹھ کر جاتے ہوئے واحد جملہ کہا۔

"حُسن آراء کو ناشتے کے بارے میں پوچھ لینا ...... نئی آئی ہے ...... ابھی اُسے جھجک ہو گی۔" دلشاد کو لگا جیسے وہ اُسے ایک بار پھر کوڑا مار کر گئے تھے' وہ اُن کے سامنے بھوکی بیٹھی رہی تھی۔ انہوں نے ایک بار بھی اُس سے ناشتے کے بارے میں نہیں پوچھا اور اُس نئی نویلی دُلہن کا اُن کو اتنا خیال تھا کہ جاتے ہوئے بھی اُسی کے بارے میں تاکید کر رہے ہے۔

اُس کا دل چاہا کہ وہ اُنہیں کہے کہ وہ ناشتے کی بجائے اُسے زہر دینے میں زیادہ دلچسپی رکھتی تھی۔

اُسے ناشتہ یا زہر دونوں میں سے کچھ بھی دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

حُسن آراء دن ڈھلے سو کر اُٹھی تھی اور جس وقت وہ منہ دھونے کے لئے صحن میں آئی اُس وقت دلشاد کے پاس محلے کی ایک عورت آ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ دلشاد حتیٰ المقدور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اندرونی کیفیات کو اُس عورت سے چھپا رہی تھی۔ اُسے توقع بھی نہیں تھی کہ حُسن آراء یوں اچانک باہر چلی آئے گی۔

حُسن آراء گلے میں دوپٹہ لٹکائے اسی طرح مسلے ہوئے کپڑوں میں جمائیاں لیتی ہوئی باہر نکل آئی۔ وہ دلشاد اور صحن میں بیٹھی دوسری عورت کو دیکھ کر چونکی تھی اور خود وہ عورت بھی اُسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"آداب۔ حُسن آراء نے سیدھا حمام کی طرف جانے کے بجائے پہلے آ کر

مسکراتے ہوئے دلشاد اور اُس عورت کو آداب کیا پھر وہ حمام کی طرف چلی گئی''۔

''ارے یہ کون ہے؟ اس عورت نے تجسس آمیز انداز میں کہا'

دلشاد نے حمام کی ٹونٹی کھولتی ہوئی حُسن آراء کو دیکھا اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا''۔

''صوفی صاحب کی دوسری بیوی'

وہ عورت بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسی۔

''ارے مذاق مت کر دلشاد...... سچ سچ بتا کون ہے یہ؟''

''میں مذاق نہیں کر رہی...... صوفی صاحب کل رات ہی نکاح کر کے لائے ہیں اسے''۔

وہ عورت بے یقینی سے اُسے اور پھر دور منہ دھوتی حُسن آراء کو دیکھتی رہی۔

''تو سچ کہہ رہی ہے دلشاد؟ اُسے جیسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا''۔

''ہاں''

''دلشاد نے رنجیدگی سے کہا' اُسے پتہ تھا...... اب چند منٹوں میں پورے محلے کی عورتیں ایک ایک کر کے اُس کے گھر آنے والی تھیں''۔

''میرے خدا...... یہ صوفی صاحب نے کیا کیا؟...... اس عمر میں اتنی کم عمر لڑکی سے شادی کر لی''۔

''چھوڑو خالہ...... اگر لڑکی کو ہی عمر کی پرواہ نہیں تو مرد کا ہے کو سوچے گا''۔

''اور ذرا اس لڑکی کے طور طریقے تو دیکھو...... دوپہر ہونے کو ہے اور اب سو کر اُٹھی ہے...... نہ سر پر دوپٹہ...... سر جھاڑ منہ پھاڑ آ کر آداب کرنے لگی''۔

خالہ اب حُسن آراء کو دیکھتے ہوئے منہ بھر بھر کر اُس کی برائیاں کرنے لگیں مگر ساتھ ساتھ اُن کی نظریں حُسن آراء کے چہرے سے ہٹ بھی نہیں رہی تھیں۔

''صوفی صاحب کی دوسری بیوی ہے خوبصورت''...... اُس نے دل میں سوچا تھا۔

''آپ نے ابا سے پوچھا کہ اس طرح دوسری بیوی کی کیا ضرورت آن پڑی تھی اُنہیں؟''

دلشاد باورچی خانے میں کھانا بنا رہی تھیں جب حُسنہ ایک بار پھر اُن کے پاس چلی آئی تھی۔

''مردوں سے ایسی باتیں نہیں پوچھی جاتیں''۔

''کیوں نہیں پوچھی جاتیں؟''

حُسنہ کا انداز بے حد عجیب تھا۔

''یہ خاندانی عورتوں کا طریقہ نہیں ہوتا''۔

''چاہے خاندانی مرد جو ''مرضی'' کرتے رہیں''۔

''تمہارے ابا نے ''جو مرضی'' نہیں کیا شادی کی ہے...... اللہ نے اجازت دی ہے اُنہیں' پھر میں اور تم روکنے والے کون ہوتے ہیں اُنہیں''۔ دلشاد نے بے حد سرد انداز میں اُسے سمجھایا۔

''آپ کے دل کو کچھ نہیں ہوتا اماں جب آپ اُنہیں اور ابا کو ساتھ دیکھتی ہیں۔ حُسنہ نے جیسے گلہ کیا''۔ ''سبزی بناؤ...... کھانے میں دیر ہو رہی ہے''۔

دلشاد نے تیزی سے موضوع بدلا۔

وہ حُسنہ سے کیا کہتی کہ دل کو جو کچھ ہو رہا تھا اُسے حُسنہ نہیں سمجھ سکتی تھی...... صرف دلشاد بیگم کی ریاست نہیں چھنی تھی بلکہ اُن کے دل کا خون کر دیا تھا۔ صوفی صاحب نے...... اعتماد' اعتبار' بھرم' لحاظ...... سب کچھ ختم ہو گیا تھا ایک ہی رات میں......

صوفی صاحب ''ایسے ویسے'' مرد ہوتے تو دلشاد کو اتنی شکایت ہوتی نہ ایسا دھچکہ پہنچتا...... سارا مسئلہ تو یہ تھا کہ صوفی صاحب ''ایسے ویسے'' آدمی نہیں تھے...... اور مسئلہ یہ

بھی تھا کہ دلشاد کو اندھا اعتماد تھا اپنے شوہر پر...... اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ 24 گھنٹے اُٹھتے بیٹھتے ہر آئے گئے کے آگے صوفی صاحب کی شرافت کا کلمہ پڑھتی تھیں...... اور اب ایک ''دوسری بیوی'' کے آ جانے سے یک دم دلشاد کو لگا تھا جیسے 35 سال صوفی صاحب بس شرافت کا لبادہ اوڑھ کر اُن کو دھوکہ دیتے رہے...... ورنہ پتہ نہیں وہ گھر سے باہر کیا کیا کرتے رہے تھے...... پتہ نہیں اِن کے علاوہ کتنی عورتیں اُن کی زندگی میں آتی جاتی رہی تھیں...... اور پتہ نہیں حُسن آرا اُن کی زندگی میں ''کب'' سے تھی' جسے ایک دن یوں دھڑلے سے وہ اپنے گھر میں لے آئے۔

''کوئی بھدی' بوڑھی' کم صورت' بداخلاق عورت صوفی صاحب کی دوسری بیوی بن کر آتی تو دلشاد کو اتنا ملال اور قلق نہ ہوتا۔ پر حُسن آراء جیسی حسین اور کم عمر لڑکی کو جب وہ صوفی صاحب کے ساتھ دیکھتی تو جیسے اُس کے دل پر برچھیاں چلنے لگتیں......

حُسن آراء کے سامنے صوفی صاحب کو اب دلشاد کہاں نظر آنے والی تھی۔ حُسن آرا کے سامنے کسی بھی مرد کو اپنی عمر رسیدہ' پرانی بیوی کہاں نظر آتی ہے' چاہے وہ کتنے بھی اونچے اور اچھے خاندان کی ہوتی...... دلشاد کو ''حال'' نہیں رُلاتا تھا ''مستقبل'' رُلا رہا تھا...... آنے والے دن اس گھر میں صرف حُسن آراء کے دن ہونے والے تھے...... اور اُنہیں اسی کا خوف تھا۔

دن آہستہ آہستہ گزرنے لگے تھے۔ شروع شروع میں محلے اور خاندان کے کئی لوگ اُن سے افسوس کے لئے آئے۔ پھر آہستہ آہستہ سب کی تعداد کم ہونے لگی۔ حُسن آراء کو جیسے سب نے قبول کر لیا تھا...... سوائے دلشاد کے......

اب صبح سویرے حُسن آراء صوفی صاحب کو کام پر جانے کے لئے دروازے تک چھوڑنے آتی اور شام کو جیسے ہی اُن کے آنے کا وقت ہوتا وہ سج سنور کر صحن میں منڈلانے لگتی۔ اُس کا سنگھار اور خوبصورتی دلشاد کو بُری طرح چبھتی تھی...... کچھ بھی کر لیتی وہ نہ تو اپنی جوانی واپس لا سکتی تھیں نہ خوبصورتی میں حُسن آراء کے مقابل آ سکتی تھیں۔

صوفی صاحب کی جگہ کوئی بھی مرد ہوتا تو وہ اسی طرح حُسن آرا کے دام

التفات کا شکار ہوتا جس طرح صوفی صاحب ہوئے تھے۔

دلشاد اور صوفی صاحب کے درمیان پہلے کی طرح اب بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی بات ہوتی بھی تو گویا حُسنہ کے بارے میں۔

فرق صوفی صاحب میں نہیں آیا تھا' دلشاد کی سوچ میں آ گیا تھا۔ وہ صوفی صاحب کی ہر بات کا غلط مطلب نکالتی تھی۔ ہر بات پر شک کرتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُن سے اُلجھ پڑتی تھی...... آخر اب اُسے ایک سلیقہ مند' وفا شعار' اطاعت گزار بیوی بن کر کیا لینا تھا۔ جس خدشے نے اُس سے یہ سب کچھ کروایا تھا۔ وہ خدشہ تو اُس کے گھر میں آ کر براجمان ہو گیا تھا۔ پھر اب بھلا اُس کا اور کیا جانا تھا۔

چند دن اور گزرنے پر دلشاد کو حُسن آراء کے انداز و اطوار بے حد کھلنے لگے۔ وہ گھر میں پازیبیں پہن کر پھرتی۔ موتیے کے گجرے بالوں میں لٹکائے رکھتی...... ہر وقت زیورات پہنے رہتی اور ہر دوسرے چوتھے دن ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگائے بیٹھی ہوتی۔

دلشاد شاید ان سب چیزوں کو نظر انداز کرتی رہتی' اگر اُسے یہ محسوس نہ ہونے لگتا کہ حُسنہ ...... حُسن آراء میں یک دم بہت زیادہ دلچسپی لینے لگی تھی......

اُس کا حُسن آراء کے لئے پہلے جیسا غصہ اور نفرت باقی نہیں رہی تھی بلکہ حُسن آراء کے ہر انداز کے لئے اُس کے پاس ستائش تھی اور یہ دلشاد کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

''کس بات سے منع کروں اُسے؟''

''صوفی صاحب کو اُس دن اُس کی شکایت نے حیران کر دیا تھا''۔ آپ کو بتایا ہے میں نے۔ دلشاد بے حد مشتعل تھی۔

''اُس سے کہوں کہ وہ سنگھار نہ کرے؟''

''اس گھر میں جوان بیٹی ہے''۔

''تو وہ بھی تو جوان ہے دلشاد''۔

دلشاد کو صوفی صاحب کی بات کانٹے کی طرح لگی۔

''ہم پر بھی جوانی آئی تھی ہم تو کبھی گھر میں اس طرح پازیبیں چھنکاتے نہیں پھرے۔''

''ہر انسان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے''۔

''اور جو وہ سنگھار کے سامان پر دھڑا دھڑ آپ کا روپیہ لُٹا رہی ہے۔''

''دلشاد کو ایک اور شکایت پیدا ہوئی۔''

''وہ اُس کا جیب خرچ ہے جو چاہے کرے...... میں نے کبھی تم سے پوچھا کہ تم اپنے جیب خرچ کا کیا کرتی ہو۔''

''میں اُس کی طرح سنگھار کے سامان پر پیسہ برباد نہیں کرتی''۔

''ابھی نیا نیا شوق ہے۔ بعد میں خود ہی سمجھ جائے گی وہ پھر تمہاری طرح وہ بھی بچت کرنے لگے گی''۔

''دلشاد نے غصّے میں اُن کی بات کاٹی''۔

اس غلط فہمی میں نہ رہیے گا۔ ہر عورت دلشاد نہیں ہوتی''۔

''جانتا ہوں دلشاد ایک ہی ہے......تم سمجھ لو حُسن آراء بھی ایک ہی ہے''۔

صوفی صاحب مزید کچھ سُنے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ دلشاد کا خون کھولنے لگا۔ یہ پہلی بار نہیں تھا کہ وہ حُسن آراء کی طرف داری کر رہے تھے وہ ہر بات پر حُسن آراء ہی کی طرف داری کرتے تھے۔ پتہ نہیں اُس نے کیا جادو کر دیا تھا اُن پر۔

"ارے دلشاد یہ میں نے کیا سُنا؟"......

صوفی صاحب نے دوسری شادی کر لی۔ بوا نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہنا شروع کر دیا۔

"ٹھیک سُنا ہے آپ نے بوا"۔

دلشاد نے اُداسی سے کہا۔

"بیٹھیں کیا کھائیں گی آپ؟"

اُس نے اُنہیں صحن کے تخت پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھاڑ میں جائے کھانا پینا مجھے تو یہ بتاؤ یہ ہوا کیسے؟ ارے میں تو صوفی صاحب کے گُن گاتی تھی"۔ بوا نے تجسس آمیز انداز میں کہا۔

"بس بوا یہ میری قسمت میں تھا"۔

"ہے کون کلموہی؟"

کلموہی تو نہیں ہے بوا ...... ہے تو خوبصورت ...... خوبصورتی پر ہی تو مرمٹے ہوں گے صوفی صاحب"۔

"ارے یہ عمر تھی اُن کی مرمٹنے کی' ساری عمر انہوں نے آنکھ اُٹھا کر تمہارے علاوہ کسی دوسری عورت کو نہیں دیکھا اور اب دیکھا بھی تو"......

"چھوڑو بوا...... بات پرانی ہوگئی"۔ دلشاد نے اُداسی سے بات کاٹی

"ارے ہے کون؟ ...... خاندان کیا ہے؟"

"نام حُسن آراء ہے ...... خاندان صوفی صاحب جانتے ہوں گے یا وہ خود جانتی ہوگی"۔

"کیوں تمہیں نہیں بتایا صوفی صاحب نے؟"

"نہیں"۔

دلشاد نے مختصر جواب دیا اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی حُسن آرا اندرونی دروازہ کھول کر باہر آ گئی تھی۔

بوا نے بے حد دلچسپی اور تجسس کے ساتھ اُس کا سر سے پاؤں تک تنقیدی جائزہ لیا۔ حُسن آرا ہمیشہ کی طرح پاس آئی۔

اُس نے آداب کیا اور پھر صحن میں لگے موتیے کے پودوں کی طرف چلی گئی۔

بوا نے اُس کے ہاتھوں پیروں میں لگی مہندی' اُس کی پازیبوں اور اُس کے انداز و اطوار کو غور سے دیکھا پھر پان پر کتھا لگاتی ہوئی دلشاد سے آہستہ آواز میں کہا۔

"خاندانی تو نہیں لگتی مجھے"۔

دلشاد نے چونک کر بوا کو دیکھا۔

"کیا مطلب؟"

"اب اگر میں صوفی صاحب کی شرافت کو نہ جانتی ہوتی تو شاید ...... پر چلو چھوڑو...... ایسی باتیں میں کیوں کروں تم سے؟"

بوا نے بڑے معنی خیز انداز میں موتیے کے پھول اپنے آنچل میں اکٹھے کرتی ہوئی حُسن آرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھل کر بات کرو بوا...... کیا کہنا چاہتی ہو؟"

دلشاد نے یک دم پریشان ہو کر کہا۔

"یہ بات ہے تو سُنو ...... مجھے تو صوفی صاحب کی دوسری بیوی طوائف لگتی ہے"۔

کسی نے دلشاد کے سر پر جیسے کوئی گُرز دے مارا تھا۔" اُس نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔"

"ہائے ...... ہائے بوا...... کیا کہہ رہی ہو؟"

"ارے میں کیا کہہ رہی ہوں ......تم خود پوچھ لینا اُس سے"۔

بوا نے یقین سے کہا۔

اور دلشاد نے دیر نہیں لگائی۔ بوا کے جاتے ہی وہ حُسن آراء کے کمرے میں چلی آئی۔

وہ موتیے کے پھولوں کا ہار بناتے ہوئے گنگنانے میں مصروف تھی۔

''گانا کہاں سے سیکھا تم نے؟'' دلشاد نے بے حد تیکھے انداز میں پوچھا۔

''کہیں سے نہیں ...... ویسے ہی گنگنا رہی تھی''۔ حُسن آرا نے قدرے گھبرا کر کہا۔

''شریف گھرانوں کی لڑکیاں اس طرح کے گانے نہیں گنگناتیں ...... تمہارے اماں اور باوا نے کبھی تمہیں روکا نہیں گانے سے''۔

''آپا آپ کو بُرا لگا تو میں نہیں گایا کروں گی''۔ حُسن آرا نے بے حد متانت سے کہا۔

''کہاں سے آئی ہو تم؟''

''ملتان سے''۔ حُسن آراء نے بے ساختہ کہا۔

''میں خاندان کا پوچھ رہی ہوں''۔ دلشاد نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''خاندان''

حُسن آراء بڑبڑائی یوں جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

''باوا کا کیا نام ہے تمہارا؟ دلشاد نے بغیر رُکے اگلا سوال کیا''۔

''وہ مر گئے''۔ حُسن آراء نے بے ساختہ کہا۔

''مر گئے مگر کوئی نام تو ہو گا''۔

''ہاں ...... ہاں ...... نام ......'' حُسن آراء بُری طرح ہکلانے لگی۔

''یہ کون سی پہیلی پوچھ لی میں نے کہ تمہیں جواب ہی نہیں آ رہا''۔

''آفتاب ...... آفتاب علی'' حُسن آراء نے بالآخر کہا۔

''کیا کرتے تھے؟'' ''میں نے بتایا وہ مر گئے''۔

''سُن لیا میں نے ...... لیکن مرنے سے پہلے کچھ تو کرتے ہوں گے۔'' دلشاد نے ناراضی سے کہا

''میرے بچپن میں ہی مر گئے''۔

''حُسن آراء ایک بار پھر ہکلائی''۔

''گھر کہاں ہے تمہارا؟''

''گھر......؟''

حُسن آراء جیسے مشکل میں پھنس گئی تھی۔

''بہن بھائی کتنے ہیں؟''

''میں اکلوتی ہوں''۔

''ماں بھی نہیں ہے کیا؟''

''نہیں''

''دلشاد کا غصہ اُس کے ہر جواب سے بڑھتا جا رہا تھا' بوا کا اندازہ بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔

''ماں نہیں باپ نہیں ...... بہن بھائی نہیں گھر نہیں تو کیا صوفی صاحب کو مسجد میں ملی تھی؟''

دلشاد نے بے حد طنزیہ انداز میں کہا۔

حُسن آراء جواب دیئے بغیر ٹکر ٹکر دلشاد کا چہرہ دیکھتی رہی۔

دلشاد شعلہ جوالا بنی حُسن آراء کے کمرے سے نکلی تھی اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سیدھی صوفی صاحب کے پاس منڈی پہنچ جائے۔

حُسنہ نے ماں کو بے حد غصّے میں صحن میں ٹہلتے دیکھا۔ اُسے حیرت ہوئی آخر آج ایسا کیا ہوا تھا کہ دلشاد کو اتنا غصہ کیوں آیا ہے؟

''کیا ہوا اماں اتنے غصّے میں کیوں ہیں؟''

اُس نے دلشاد کے پاس آ کر پوچھا

''غصّے میں؟...... میرا تو دل چاہ رہا ہے میں زہر کھا کر مر جاؤں''۔

''خدانخواستہ......'' حُسنہ ہول گئی۔

''آخر ہوا کیا ہے؟''

''تجھے پتہ ہے حُسن آراء کون ہے؟''

''ابا کی دوسری بیوی ہے اور کون ہے''۔

''طوائف ہے''۔

''دلشاد نے اُس کی بات کاٹ کر کہا''۔

''کیا؟''

حُسنہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ساری دنیا کی عورتیں چھوڑ کر تیرے ابا کو ایک طوائف ہی ملی تھی اس گھر میں لا بٹھانے کو''۔

''آپ کو کس نے بتایا اماں؟'' حُسنہ کو ابھی بھی یقین نہیں آیا۔

''اُس کم بخت نے خود بتایا ہے''......

''ارے نہ بھی بتاتی تو بھی مجھے پتہ چل ہی جاتا...... خاندانی عورتوں اور ایسی

عورتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے''۔

دلشاد نے دانت پیس کر کہا۔

''پر اماں اب تو آ گئی یہاں اب کیا ہو سکتا ہے...... ابا بیاہ کر لائے ہیں اُسے''۔

حُسنہ نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

''ساری عمر میں لوگوں کے سامنے تمہارے ابا کی شرافت کی قسمیں کھاتی رہی...... ارے مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ طوائفوں کے کوٹھے پر جاتے ہیں''۔

دلشاد آگ بگولہ ہو رہی تھی۔

''اور خبردار تم اُس کے قریب بھی پھٹکی تو''۔

''میں کہاں اُس کے پاس جاتی ہوں اماں''۔ حُسنہ نے احتجاج کیا۔

''جھوٹ مت بولو...... میں نے کئی بار دیکھا ہے تمہاری نظریں ہر وقت اُس پر لگی رہتی ہیں''۔

''وہ خوبصورت ہی اتنی ہے کہ اماں......''

دلشاد نے اُس کی بات کاٹ کر اُسے جھڑکا۔ ''اب تو ماں کے سامنے اُس کے حُسن کے قصیدے پڑھے گی۔ غضب خدا کا جمعہ جمعہ چار دن ہوئے اُس طوائف کو اس گھر میں آئے اور تمہارے رنگ ڈھنگ بدلنے لگے''۔

دلشاد اب حُسنہ کو رگیدنے لگی۔

حُسنہ نے بہتر سمجھا کہ وہ اس وقت دلشاد کے سامنے سے ہٹ جائے۔

"کیا ہوا دلشاد؟"

صوفی صاحب کو کمرے میں آتے ہی دلشاد کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

"میں کہتی ہوں صوفی صاحب آخر مجھ سے کون سی غلطی کون سا گناہ ہو گیا تھا کہ آپ نے حُسن آراء کو اس گھر میں لا بٹھایا؟"

"کیوں کیا ہو گیا؟...... حُسن آراء سے کوئی جھگڑا ہو گیا؟"

"میں خاندانی عورت ہوں اور خاندانی عورتیں طوائفوں کے ساتھ منہ ماری نہیں کرتیں"۔

اُس کے جملے پر صوفی صاحب ایک لمحے کے لئے جیسے سناٹے میں آ گئے۔

"طوائف کسے کہہ رہی ہو تم؟"

"اچھی طرح جانتے ہیں آپ کہ اس گھر میں طوائف کون ہے...... ارے صوفی صاحب ہمارے خاندانوں میں شادی پر مجرے کرنے کے لئے طوائفیں بلائی جاتی ہیں ......کوئی اُنہیں خاندانی بیویوں کے برابر نہیں لا بٹھاتا۔"

صوفی صاحب نے دلشاد کو مزید بات کرنے نہیں دی۔

"اب تمہیں پتہ چل گیا ہے تو اس راز کو یہیں دفن کر دو...... حُسن آراء طوائف تھی یا جو بھی تھی ...... میں نکاح کر کے اُسے اپنی عزت بنا کر اس گھر میں لایا ہوں اور میں دوبارہ اُس کے لئے طوائف کا لفظ برداشت نہیں کروں گا"۔

دلشاد نے اس سے پہلے صوفی صاحب کو کبھی اتنے غصّے میں نہیں دیکھا تھا۔ مگر زندگی میں اس سے پہلے اُس نے صوفی صاحب کو اور بھی بہت کچھ کرتے نہیں دیکھا تھا۔

اس انکشاف کے بعد دلشاد کا حُسن آراء کے ساتھ رویہ بے حد ہتک آمیز ہو

گیا تھا۔ وہ کھانے پکانے میں پہلے جس طرح اُس کی مدد قبول کر لیتی تھی اب یک دم اُس نے حُسن آراء کو گھر کے معاملات سے الگ کر دیا تھا۔

اُس دن وہ کپڑے دھو رہی تھی جب حُسن آراء نے اُس کے پاس آ کر کہا۔

"لائیں آپا میں دھو دیتی ہوں"۔

"تم کام کاج کی فکر مت کرو تمہیں گھر چلانے کے لئے نہیں لائے صوفی صاحب"۔

دلشاد نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔

"آپا پہلے بھی تو میں ہی دھوتی تھی"۔

حُسن آرا نے اُس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے مجھے یہ تھوڑی پتہ تھا کہ تم کہاں سے آئی ہو"۔

"میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں طوائف کہاں بنتی ...... میرے ساتھ نکاح کیا ہے صوفی صاحب نے ...... کچھ نہ کچھ تو دیکھا ہی ہو گا انہوں نے مجھ میں"۔

"طوائفوں میں کیا دیکھ کر مرد اُنہیں بیویاں بنا کر لے آتے ہیں یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں"۔

"میں خاندانی عورت نہ سہی پر بننے کی کوشش تو کر سکتی ہوں"۔

"اگر خاندانی بننا اتنا ہی آسان ہوتا تو ہر دوسری طوائف خاندانی بن کر بیٹھی ہوتی ...... ارے بی بی خاندانی عورت مر بھی جائے تو طوائف نہیں بنے گی اور طوائف مر بھی جائے تو بھی خاندانی کبھی نہیں کہلائے گی"۔

حُسن آراء کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا مزید ایک لفظ کہے بغیر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔

دلشاد نے حُسن آراء کو یک دم جیسے چھوت کی بیماری بنا دیا تھا۔ وہ پہلے بھی حُسنہ کو اُس کے پاس جانے سے روکتی تھی لیکن اب تو وہ حُسنہ پر کڑی نظر رکھتی تھی کہ وہ کہیں بھولے سے بھی حُسن آراء کے پاس نہ جائے۔

اس کے باوجود اُسے محسوس ہوتا کہ حُسنہ اکثر اوقات حُسن آراء کے آس پاس

منڈلاتی نظر آتی۔ دلشاد کو بے حد طیش آتا۔ آخر وہ پہلے کی طرح حُسن آراء سے نفرت کا اظہار کیوں نہیں کرتی تھی۔ اُسے ناپسند کیوں نہیں کرتی تھی ...... اس عمر میں باپ کی نئی نویلی دوسری بیوی میں آخر حُسنہ کو کیا نظر آنے لگا تھا کہ وہ اُس کے پاس سے ہٹتی ہی نہیں تھی اور دلشاد کو یہ خوف تھا کہ ایک طوائف اُس کی خاندانی بیٹی کو کچھ ایسا ویسا نہ سکھا دے کہ اُن کی سالوں کی خاندانی تربیت کا اثر مٹی میں مل جائے۔

حُسنہ کی شادی کی فکر اُنہیں پہلے بھی تھی مگر اب یک دم اس میں اضافہ ہو گیا۔ بوا کے چکر بھی اُن دنوں اُن کے گھر کچھ کم ہو گئے تھے اور خود حُسنہ بھی یک دم بے حد اُداس اور پریشان رہنے لگی تھی۔ اُسے گم صم بیٹھا دیکھ کر دلشاد کا دل کٹتا تھا۔ وہ ماں تھیں جانتی تھیں حُسنہ کو کیا غم کھائے جا رہا تھا مگر اُن کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

اُس دن دلشاد پودوں کو پانی دے رہی تھیں جب انہوں نے حُسن آراء کو سولہ سنگھار کئے بے حد ناز و ادا سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر جاتے دیکھا۔ وہ یک دم چونک گئیں۔ سر اُٹھا کر انہوں نے اوپر چھت کی طرف دیکھا اور جیسے اُن کو کرنٹ لگ گیا۔ برابر والی چھت پر ہمسائے کا لڑکا اکبر اپنے کبوتروں کو اُڑانے میں مصروف تھا۔

دلشاد پودوں کو پانی دینا بھول گئیں۔ حُسن آراء اب چھت پر پہنچ چکی تھی دلشاد کو اور کچھ نہ سوجھا تو وہ یک دم دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر خود بھی اُوپر پہنچ گئیں مگر سیدھا چھت پر جانے کی بجائے وہ آخری سیڑھی پر ہی رک گئیں۔

حُسن آراء چھت پر بڑے ناز و ادا سے ٹہلتے ہوئے اکبر کی طرف دیکھ کر مسکراتی رہی۔

اکبر نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا اور اُس کی نظر جیسے حُسن آراء سے چپک کر رہ گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ حُسن آراء کو دیکھتا رہا۔

پھر دونوں کے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ اکبر اتنی حوصلہ افزائی پا کر یک دم منڈیر کے قریب آ گیا۔

''السلام علیکم''۔

اُس نے بڑے عاشقانہ انداز میں حُسن آراء کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام''۔ حُسن آراء نے بھی اُسی ناز سے جواب دیا۔

''آپ کا نام جان سکتا ہوں؟''

''حُسن آراء''۔

''بے شک یہی نام ہونا چاہیے آپ کا''۔

اکبر نے بے ساختہ کہا۔

''اچھا...... اور آپ کا نام کیا ہے؟''

حُسن آراء نے بے ساختہ ہنس کر کہا۔

''اکبر''۔

''اکبر بادشاہ''۔

حُسن آراء نے جیسے اُسے چھیڑا۔

''آپ نے بادشاہ کہہ دیا تو سمجھیں میں بادشاہ ہو گیا''۔

اکبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور میں فقیر کہہ دیتی تو؟''

حُسن آراء نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''تو فقیر ہو جاتا''۔

اکبر نے بے ساختہ انداز میں کہا۔

''آپ کو پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا حُسنہ کی رشتہ دار ہیں کیا؟''

''ہاں بہت قریبی''۔

''اچھا...... کیا ہیں آپ؟''

''ماں''۔

''اکبر نے بے اختیار پان کی پیک تھوکی اور قدرے گھبرا کر کہا۔ ''صوفی صاحب کی دوسری بیوی؟''

''ہاں''۔

''صوفی صاحب بھی بڑے خوش قسمت ہیں اس بڑھاپے میں خزانہ ہاتھ لگ گیا اُن کے''۔

سیڑھیوں میں کھڑی دلشاد کا خون کھولنے لگا حُسن آراء اکبر کی بات پر ہنس رہی تھی۔ دلشاد اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکیں۔ صوفی صاحب کو بانٹ لیا تھا انہوں نے مگر اکبر اُن کی اکلوتی بیٹی کی پسند تھا' وہ جانتی تھیں حُسنہ اُسے پسند کرتی ہے اور دلشاد حُسن آراء کو اکبر پر کسی قیمت پر بھی ہاتھ صاف نہیں کرنے دے سکتی تھیں۔

''حُسن آراء''۔

وہ یک دم بلند آواز میں پکارتے ہوئے سامنے آ گئیں۔ انہوں نے جان بوجھ کر اکبر کو بھاگنے کا موقع دیا۔

اکبر واقعی اُن کی آواز سن کر گھبرا کر بھاگ گیا تھا۔

گھبرا تو حُسن آراء بھی گئی تھی۔

وہ اکثر ہی چھت پر آتی تھی ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ دلشاد کبھی اُس کے پیچھے آئی ہو اور اب وہ یک دم بگڑے تیوروں کے ساتھ وہاں کھڑی تھیں۔

''کیا کر رہی تھی تم یہاں؟''

دلشاد نے بے حد طیش میں کہا۔

''کچھ نہیں ایسے ہی آپا...... دل گھبرا گیا تھا تو اوپر آ گئی''۔ حُسن آراء نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''یہ شریفوں کا گھر ہے...... خاندانی لوگوں کا...... یہاں یہ بازاری طور طریقے نہیں چلیں گے...... ہمارے گھروں کی عورتیں کمروں میں بیٹھتی ہیں...... کھڑکیوں' جھروکوں اور چھتوں پر لٹکتی مٹکتی نہیں پھرتیں''۔ دلشاد نے تیز آواز میں اُس سے کہا۔

''آپا میں تو صرف چہل قدمی کے لیے......''

دلشاد نے حُسن آراء کو بات مکمل کرنے [illegible]

ہو اس لئے ہر وقت کوٹھے کی طرف بھاگتی ہو۔ مگر پھر بھی شریف گھرانوں کی عورتوں کی طرح رہنے کی کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں''۔

حُسن آراء جواب میں کچھ کہنے کی بجائے یک دم سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے چلی گئی۔

دلشاد غصّے سے پھنکارتی ہوئی اُس کے پیچھے گئیں۔ اُنہیں یقین تھا حُسن آراء اب دوبارہ چھت پر آنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ مگر اُن کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔

اگلے ایک دو ہفتوں میں انہوں نے کئی بار حُسن آراء کو اُس وقت چھت پر جاتے دیکھا جب اکبر وہاں ہوتا۔ لیکن پہلی بار کی طرح وہ حُسن آراء اور اکبر کو کبھی اکٹھے پکڑ نہیں سکیں۔ کیونکہ حُسن آراء اب بے حد محتاط ہو گئی تھی۔

دلشاد کے اشتعال میں اضافہ ہوتا گیا اور بالآخر انہوں نے صوفی صاحب سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن صوفی صاحب اُس کی بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے تھے۔ ''تم کس عشق کی بات کر رہی ہو؟''

''ساتھ والوں کے اکبر پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے وہ...... ماں کا گھر تو اُجاڑ دیا اُس نے' اب وہ بیٹی کا گھر بسنے سے پہلے ہی تباہ کرنے کے درپے ہے۔ طوائف زادی ہے منہ مارنے سے باز تھوڑی آئے گی''۔

''زبان کو لگام دو دلشاد''۔

صوفی صاحب بے حد طیش میں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''میری زبان کو لگام دینے سے بہتر ہے آپ اپنی چہیتی بیوی کے پر کاٹ دیں جو چھت پر سارا دن کبوتری کی طرح غٹرغوں کرتی پھرتی ہے''۔ دلشاد نے ترکی بہ ترکی کہا۔

صوفی صاحب سرخ چہرے کے ساتھ کچھ دیر دلشاد کو دیکھتے رہے پھر یک دم کمرے سے نکل کر حُسن آراء کے پاس چلے آئے۔

''آپ یقین کریں صوفی صاحب آپا کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میرے بارے میں میں چھت پر کبھی کبھار جاتی ضرور ہوں مگر صرف ہوا خوری کے لئے''۔ حُسن آراء نے اُن کے بات کرتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''مگر وہ کہتی ہے تم ......'' صوفی صاحب اس بار بات کرتے ہوئے بے اختیار جھجکے۔ ''میرا مطلب ہے تم اور ساتھ والوں کا اکبر ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہیں''۔

حُسن آراء نے بے اختیار اپنے گال پیٹے۔ ''میرے خدا صوفی صاحب ...... میں آپ کی منکوحہ ہوں میں ساتھ والوں کے اکبر کے ساتھ ...... آپا کو کیا ہو گیا ہے...... میں بھلا جانتی نہیں کیا، کہ وہ اکبر کے ساتھ حُسنہ کی بات چلانے کی کوشش کر رہی ہیں ...... میں تو بس اسی لئے اگر وہ کبھی چھت پر نظر آئے تو اُس کا حال احوال پوچھ لیتی ہوں''۔

صوفی صاحب کو یک دم حُسن آراء کی بات پر یقین آ گیا۔

''دلشاد دل کی بُری نہیں ہے بس ذرا جذباتی ہو جاتی ہے' تم پھر بھی احتیاط ہی کیا کرو...... اور چھت پر زیادہ مت جایا کرو''۔

''جی اچھا میں احتیاط کروں گی''۔ حُسن آراء نے بے حد فرمانبرداری سے کہا۔

صوفی صاحب مطمئن ہو کر کمرے سے چلے گئے۔

دلشاد اور صوفی صاحب کو واقعی دوبارہ کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ اور پورے دو ہفتے کے بعد ایک دن بوا بے حد خوشی کے عالم میں ہانپتی کانپتی دلشاد کے گھر آئی۔

''ارے میرا منہ میٹھا کرواؤ دلشاد''

بوا نے آتے ہی دلشاد سے کہا۔

''کیا ہوا بوا؟ ...... کس بات کی مٹھائی؟''

دلشاد نے قدرے حیرانی سے بوا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بوا کی محنت رنگ لے آئی ہے دلشاد ......

اکبر میاں کی ماں نے آج مجھے بلوا کر کہا کہ وہ کل حُسنہ کا ہاتھ مانگنے یہاں آنا چاہتی ہیں''۔

دلشاد کو ایک لمحے کے لئے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ''کیا کہہ رہی ہو بوا؟''

اس سے پہلے کہ بوا کچھ کہتی حُسن آراء بڑے انداز سے پان چباتے اندر کمرے سے نکل آئی' اُس کو دیکھتے ہی دلشاد نے خوشی سے جیسے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے بوا ذرا اونچی آواز میں یہ خوشی کی خبر سناؤ کہ اکبر کی ماں حُسنہ کا رشتہ مانگنے یہاں آ رہی ہے''۔

حُسن آراء ان دونوں کی طرف آتے ہوئے چونکی' ٹھٹھکی اور مسکرائی۔

''مبارک ہو آپا''۔ اُس نے دلشاد سے کہا جس نے اُس کی مبارکباد کو نظر انداز کرتے ہوئے حُسنہ کو آواز لگائی۔

''ارے حُسنہ اندر سے جلیبیاں لاؤ بوا کا منہ میٹھا کروانا ہے......''

حُسنہ چند لمحوں میں جلیبیوں کی پلیٹ کے ساتھ باہر تھی۔ یوں جیسے اُس نے پہلے ہی اندر بوا اور دلشاد کی ساری باتیں سن لی ہوں' اُس کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔

باہر نکلتے ہوئے حُسن آراء سے اُس کی نظریں ملیں' دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں۔

اور دلشاد نے بے حد ناگواری کے ساتھ اس مسکراہٹ کو دیکھا۔

"دیکھا تم خوامخواہ شک کر رہی تھیں حُسن آراء پر ایسی کوئی بات ہوتی تو اکبر حُسنہ کے لئے کہاں رشتہ بھجواتا"۔

صوفی صاحب کے شام کو گھر آنے پر دلشاد نے اُنہیں یہ خبر سنائی تھی اور انہوں نے دلشاد کو مبارکباد دینے کے ساتھ ہی یہ بات کہی۔

دلشاد کو بہت بُرا لگا۔ "آپ کو ابھی بھی حُسن آراء کی صفائیاں دینے کی پڑی ہے......

"ارے یہ میری دعائیں ہیں جو رنگ لائی ہیں"۔ دلشاد نے بڑے جوش سے کہا۔ "پھر بھی تم اُس سے معافی مانگ لینا تمہاری باتوں کی وجہ سے میں ......"

دلشاد نے صوفی صاحب کی بات تیزی سے کاٹ دی۔

"ارے اب میں اس عمر میں آپ کی اس چہیتی بیوی کے سامنے جا کر ہاتھ نہیں جوڑ سکتی ......"

"آپ اُسے منع نہ کرتے تو وہی ہوتا جس کا مجھے خدشہ تھا"۔

دلشاد بے حد غصّے سے کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

اکبر کی ماں نے اگلے دن آ کر نہ صرف حُسنہ کا رشتہ مانگا تھا بلکہ ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی ......

اُسے حج پر جانا تھا اور وہ جانے سے پہلے پہلے بیٹے کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔

جس کا مطلب تھا کہ دلشاد کو چند ہفتوں کے اندر اندر حُسنہ کو بیاہ دینا تھا۔

حُسنہ کی شادی جس مشکل سے ہو رہی تھی چند ہفتوں کی بجائے دلشاد کو اگر چند دنوں کے اندر بھی اُسے بیاہنا پڑتا تو وہ اُسے بیاہ دیتی۔

بڑی دھوم دھام سے حُسنہ کی شادی اکبر کے ساتھ دو ہفتے کے بعد ہوگئی۔

شادی کی تیاریوں میں حُسن آراء نے بھی جی جان سے ساتھ دیا تھا۔ دلشاد کو اُس کے انداز سے کہیں یہ نہیں لگا کہ وہ اس شادی سے ناخوش ہے۔ لیکن اس کے باوجود دلشاد کو اُس پر ایک عجیب سا شک تھا۔ وجہ کیا تھی اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

شادی کی ہر رسم میں حُسن آراء آگے آگے رہی تھی اور دلشاد کو اُس کے اکبر کے یوں پاس ہونے پر یک دم اُلجھن اور گھبراہٹ ہونا شروع ہو جاتی۔ اُن دونوں کی نظروں کے تبادلے میں کچھ ایسا تھا جو دلشاد کو ٹھیک نہیں لگتا تھا۔

شادی کے بعد حُسنہ اکبر کے ساتھ دلشاد کو بے حد خوش اور مگن نظر آتی تھی' مگر اس کے باوجود دلشاد کو تسلی نہیں ہوئی۔ اُس نے ایک بار حُسنہ سے پوچھ ہی لیا۔

"اماں میں بہت خوش ہوں اُن کے ساتھ۔"

"حُسنہ نے شرماتے ہوئے کہا"۔

"اور وہ؟"

"دلشاد نے جیسے بال کی کھال اُتاری۔ وہ بھی ...... آخر وہ کیوں خوش نہیں ہوں گے میرے ساتھ؟"

حُسنہ نے قدرے چونک کر ماں کو دیکھا۔

دلشاد نے اس موقع پر نصیحت کرنا ضروری سمجھا۔

"دیکھو حُسنہ اپنے میاں پر نظر رکھنا ...... مجھے اچھا نہیں لگتا جب وہ حُسن آراء کو گھورتا ہے۔"

"اماں وہم ہے آپ کو ...... انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہ شادی اُن کی پسند سے ہو رہی ہے"۔

حُسنہ بات کرتے ہوئے ایک بار پھر شرمائی۔

"جانتی ہوں پسند سے ہی ہوئی ہوگی' ہر مرد خاندانی عورت کو ہی بیوی بنانا چاہتا ہے"۔

دلشاد نے فخریہ انداز میں کہا۔

''مگر یہ طوائفیں تم ان کے مکروفریب اور چلتر نہیں جانتیں''۔

''پر اماں وہ ابا کی بیوی ہے اب''۔

حُسنہ نے اُس کی حمایت کی۔

اب ......مگر کب تک ...... جو لچھن اُس کے ہیں وہ بہت جلد اڑن چھو ہو جائے گی یہاں سے ......

بس اپنے میاں پر نظر رکھو تم ...... سمجھی؟'' ......

''جی اماں''۔

حُسنہ نے مزید کچھ نہیں کہا۔

دلشاد کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اکبر اور حُسن آراء واقعی ایک دوسرے سے حد سے زیادہ بے تکلف تھے۔

اکبر شادی کے بعد اب صوفی صاحب کے گھر تقریباً روز آنے لگا تھا اور حُسن آراء بڑی گرم جوشی سے اُس کا استقبال کرتی

اور دلشاد سلگتی رہتی۔

وہ دونوں زیادہ تر وقت اکٹھے ہی بیٹھے رہتے اور اکبر زیادہ تر صوفی صاحب کی عدم موجودگی میں ہی آتا۔

دلشاد کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اُسے گھر آنے سے کیسے روکے' آخر وہ اب اُن کا داماد تھا۔ وہ اُسے گھر آنے سے منع کر سکتی تھیں نہ حُسن آراء کے پاس بیٹھنے سے ......

لیکن حُسن آراء کو منع کیا جا سکتا تھا اور یہ کام انہوں نے ایک دن اکبر کے جانے کے فوراً بعد کیا۔

''دیکھو حُسن آراء اکبر داماد ہے صوفی صاحب کا''۔

حُسن آراء اُن کا منہ دیکھنے لگی۔

''اور تم بھی اُسے ''داماد'' ہی سمجھو''۔

دلشاد نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں داماد ہی سمجھتی ہوں اُسے آپا''۔

حُسن آراء نے قدرے دھیمے انداز میں کہا۔

''داماد سمجھتی ہو تو پھر اُس کے آس پاس اتنا منڈلانے کی ضرورت نہیں ہے خبردار آئندہ اکبر کے پاس بیٹھ کر گپیں ہانکنے کی کوشش کی تو''۔

حُسن آراء کچھ بھی کہنے کی بجائے صحن سے اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مگر اُس کی خاموشی نے دلشاد کو مطمئن نہیں کیا۔

اکبر دو دن کے بعد پھر آیا تھا اور حُسن آراء ایک بار پھر پہلے کی طرح اُس کے پاس بیٹھی رہی دلشاد کا خون کھولتا رہا۔

حُسن آراء واقعی ڈھیٹ تھی۔ البتہ اس دن اُس نے پہلے کی طرح اکبر کی خاطر مدارت نہیں کی۔

اکبر کے لئے شربت بنانے بھی دلشاد کو ہی جانا پڑا اور یہ دلشاد کے لئے زیادہ پریشانی کی بات تھی' وہ اُن کے پاس بیٹھی رہتی تو کم از کم اُن دونوں پر نظر تو رکھ سکتی تھیں۔

شربت بناتے ہوئے بھی اُن کا سارا دھیان صحن سے آنے والے قہقہوں کی طرف ہی رہا۔ انہوں نے بالآخر باورچی خانے کی کھڑکی کی درز سے باہر جھانکا۔

اکبر حُسن آراء کو کچھ دے رہا تھا جسے حُسن آراء دوپٹے میں باندھ رہی تھی۔

دلشاد کے جیسے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تو اب نوبت تحفے تحائف تک آن پہنچی تھی۔

وہ شربت لے کر باہر چلی آئیں۔ اکبر اور حُسن آراء اب بے حد سنجیدہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دلشاد کا دل چاہا۔ حُسن آراء کا گلا گھونٹ دے۔

اکبر کے گھر سے جاتے ہی دلشاد نے آ کر اکھڑ انداز میں حُسن آراء سے کہا۔

''اکبر نے کیا دیا ہے تمہیں؟''

حُسن آرا گھبرا گئی۔ ’’مجھے؟......
مجھے تو کچھ بھی نہیں دیا آپا‘‘۔

دلشاد نے مزید کوئی سوال جواب کرنے کی بجائے یک دم حُسن آراء کا دوپٹہ کھینچ لیا۔

حُسن آراء کا رنگ اُڑ گیا۔

دلشاد نے دوپٹے کا بندھا ہوا پلو کھولا اور غصّے سے اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
وہ حُسنہ کی شادی کی ایک انگوٹھی تھی۔ داماد اُن کی بیٹی کا زیور لا لا کر سوتیلی ساس کو دے رہا تھا۔

’’کچھ نہیں دیا اُس نے تمہیں؟‘‘ دلشاد نے دانت پیستے ہوئے حُسن آراء سے کہا‘‘۔

’’اوہ آپا یہ انگوٹھی تو مجھے یہیں سے ملی ہے...... حُسنہ کی ہے یہ......
اُس دن آئی تھی تو حمام کے پاس چھوڑ کر چلی گئی......
میں نے پلو میں باندھ لی کہ اُسے لوٹا دوں گی‘‘۔ حُسن آراء نے بے حد اطمینان سے کہا۔

دلشاد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ حُسن آراء کو اُٹھا کر اپنے گھر سے باہر پھینک دے۔

’’اچھا...... کل آئے گی حُسنہ تو پوچھتی ہوں میں اُس سے‘‘۔

دلشاد کو یقین تھا کہ حُسنہ کہہ دے گی کہ اُس کو اس انگوٹھی کا پتہ نہیں ہے۔

لیکن اگلے دن وہ اس وقت ہکا بکا رہ گئی تھی جب اُن کے سارا قصہ سنانے پر حُسنہ نے بے حد اطمینان سے اُنہیں کہا۔

’’حُسن آراء سچ کہہ رہی ہے اماں یہ انگوٹھی واقعی میں حمام کے پاس بھول گئی تھی۔
گھر میں ڈھونڈ رہی تھی دو دن سے‘‘۔

’’میں نے خود اکبر......‘‘

حُسنہ نے ناراضگی سے ماں کی بات کاٹی
’’کیسی باتیں کرتی ہیں اماں......
اتنا شک بھی اچھا نہیں ہوتا......
آخر اکبر کیوں دیں گے یہ انگوٹھی حُسن آراء کو......
اب آپ کہیں ایسی باتیں ابا سے مت کیجیے گا......
’’کتنی بے عزتی ہو گی خوانخواہ میں آپ کی‘‘۔

حُسنہ نے جیسے اُسے جتایا تھا کہ صوفی صاحب اُس کی بات پر یقین نہیں کریں گے۔

دلشاد کی سمجھ میں نہیں آیا وہ حُسنہ سے کیا کہے۔ اُنہیں یقین تھا انہوں نے وہ انگوٹھی اکبر کو حُسن آراء کو دیتے ہوئے دیکھا تھا اور حُسنہ اُنہیں یقین دلا رہی تھی کہ اُن کی آنکھوں کو دھوکا ہوا تھا۔ کیا وہ واقعی سٹھیانے لگی تھیں۔

وہ اُس دن کسی کام سے حُسنہ کے گھر گئی تھیں۔ اُنہیں حُسنہ کو ساتھ لیکر حکیم کے پاس جانا تھا۔ حُسنہ ماں بننے والی تھی اور ان دنوں اُس کی طبیعت گری گری رہتی تھی۔ اکبر کی ماں کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے آجکل یہ ذمہ داری بھی دلشاد کے سر پر ہی آ گئی تھی۔

حُسنہ کو اُس کے گھر سے ساتھ لیکر نکلتے ہوئے حُسنہ نے اُنہیں یاد دلایا کہ اُس کی چادر اُن کے گھر پر رہ گئی تھی۔

دلشاد نے اُس سے کہا کہ وہ اُس چادر کو بعد میں بھجوا دے گی مگر حُسنہ کا اصرار تھا کہ وہ اُسی وقت اُس چادر کو لے گی۔

دلشاد اُسے وہیں ٹھہرا کر جلدی سے گھر واپس آئیں اور کچھ حیران رہ گئیں۔ اُن کے گھر کا بیرونی دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اُنہیں بے اختیار غصہ آیا۔ ''کہہ کر بھی گئی تھی میں حُسن آراء سے کہ دروازہ اچھی طرح بند کر لے مگر مجال ہے اُس کے کانوں پر جوں بھی رینگے''۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر آئیں اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں۔ مگر پھر اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے یک دم وہ ٹھٹھک گئیں۔ حُسن آراء کے کمرے سے ہلکے ہلکے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک لمحہ کو اُنہیں شک ہوا کہ شائد صوفی صاحب گھر پر آ گئے تھے ...... مگر صوفی صاحب اُس وقت گھر پر کیسے ہو سکتے تھے۔ وہ تو اُس دن محلے کی مسجد کی مرمت کروانے کے لئے سارا دن وہیں رُکنے والے تھے۔

دلشاد تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر حُسن آراء کے کمرے کے دروازے تک آئیں اور کھلے دروازے کی جھری سے اُس نے اندر جھانکا۔ اُن کے پیروں کے نیچے سے یک دم جیسے زمین نکل گئی تھی۔

کمرے میں اکبر حُسن آراء کے ساتھ موجود تھا۔ دونوں بے حد قریب قریب

صوفہ پر بیٹھے تھے اور حُسن آراء وقفے وقفے سے اکبر کے کندھے پر سر رکھ رہی تھی۔

ایک لمحے کو دلشاد کا دل چاہا وہ اندر جائے اور حُسن آراء کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی باہر لے آئے مگر دوسرے ہی لمحے ہوش نے جیسے جوش کی جگہ لے لی تھی۔

دبے پاؤں وہاں سے ہٹ کر دلشاد تقریباً بھاگتے ہوئے گھر سے نکلیں اور مسجد جا پہنچیں۔

آج بالآخر اُس کے پاس حُسن آراء سے جان چھڑانے کا سنہری موقع ہاتھ آ ہی گیا تھا ...... صوفی صاحب کو اُن کی زبان پر یقین نہیں تھا آج وہ اُنہیں آنکھوں دیکھی صرف سُنا نہیں دکھا بھی سکتی تھیں۔

صوفی صاحب اس طرح اُنہیں اچانک مسجد میں دیکھ کر گھبرا گئے تھے اور دلشاد کے گھر چلنے کے اصرار پر وہ کچھ اور تشویش میں مبتلا ہو گئے۔

مگر دلشاد کے مجبور کرنے پر وہ سوال جواب کرنے کی بجائے اُن کے ساتھ گھر چل پڑے تھے۔

دلشاد پانچ منٹ کے فاصلہ کو طے کرتے ہوئے دعائیں کرتی رہی تھیں
''کہ اکبر ابھی بھی اُس کے گھر پر ہی ہو اور زندگی میں پہلی بار اُن کی دعائیں رنگ لائی تھیں۔''

وہ جب صوفی صاحب کو اپنے ساتھ لے کر حُسن آراء کے کمرے میں پہنچیں تو اکبر اور حُسن آراء وہیں پر اُسی طرح اٹھکیلیاں کرنے میں مصروف تھے۔

دروازہ یک دم کھلنے پر وہ دونوں ہڑبڑا کر اُٹھے تھے۔ قیامت اُن دونوں پر نہیں ٹوٹی تھی۔ صوفی صاحب کا چہرہ دیکھ کر دلشاد کو لگا جیسے قیامت صوفی صاحب پر ٹوٹ پڑی ہو۔ اکبر چند لمحے تھر تھر کانپتا رہا پھر سر جھکا کر ایک لفظ کہے بغیر حُسن آراء کے کمرہ سے چلا گیا۔

''دیکھ لیا آپ نے ...... یہ تھا وہ سچ جسے میری زبان سے سن کر آپ کو کبھی اعتبار نہیں آیا''۔

دلشاد نے بلند آواز میں صوفی صاحب سے کہا۔ جو صرف حُسن آرا کو دیکھتے جا رہے تھے۔

''یہی دن دیکھنے کے لئے خاندانی عورت کے سامنے طوائف لائے تھے آپ ...... ارے میں نہ کہتی تھی یہ طوائفیں کبھی خاندانی نہیں ہو سکتی ...... ارے صوفی صاحب تین لفظ کہہ کر اسے ابھی فارغ کریں''۔

دلشاد نے صوفی صاحب سے کہا حُسن آرا نے سر اُٹھا کر صوفی صاحب کو نہیں دیکھا۔ سر جھکائے ہوئے کہا۔

''طلاق نہ دیں صوفی صاحب میں ویسے ہی گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہوں''۔

مدھم آواز میں اُس کے جملے نے دلشاد کے تن بدن میں جیسے نئے سرے سے آگ لگا دی۔

''ارے بے شرم' بے حیا...... صوفی صاحب کی عزت کو داغدار کرنے والی...... تجھے صوفی صاحب کا نام چاہیے...... ارے تجھے عزت کا مطلب بھی پتہ ہے''۔

''پتہ ہے آپا...... ایک اسی گھر میں آ کر ہی تو پتہ چلا ہے مجھے''۔

حُسن آراء نے اُسی طرح کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

''آپ نے دیدہ دلیری دیکھی اس کی ...... میں کہتی ہوں اس کو طلاق دے کر ابھی گھر سے نکال دیں''۔

''آج رہنے دو کل طلاق دے دوں گا ...... پھر چلی جائے گی وہ اس گھر سے''۔

صوفی صاحب نے رنجیدہ اور شکست خوردہ انداز میں کہا۔

''ابھی ...... اسی وقت کیوں نہیں؟''

دلشاد نے کہا۔

''شام ہونے والی ہے دلشاد...... سامان سمیٹتے اُس کو دیر لگے گی''۔

صوفی صاحب کہہ کر باہر نکل گئے۔

''ابھی بھی اُس چڑیل کا اتنا خیال ...... اتنا احساس ...... ارے ابھی بھی اُسے سامان دیں گے ...... میرا بس چلے تو اُسے خالی ہاتھ دھکے دے کر یہاں سے نکال دوں''۔

دلشاد بولتے ہوئے غصّے میں اُن کے پیچھے گئی۔ مگر صوفی صاحب گھر سے نکل چکے تھے۔

❁

اُس رات دلشاد کئی مہینوں کے بعد پہلی بار چین کی نیند سوئی اور اُس رات صوفی صاحب پوری رات نہیں سو سکے۔ انہوں نے جو دیکھا تھا اُس پر اُن کو یقین نہیں آ رہا تھا مگر یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

حُسن آراء نے کوئی صفائی کوئی وضاحت پیش نہیں کی تھی پھر وہ کیسے کہتے کہ سب کچھ جھوٹ تھا۔

اُس رات اپنے کمرے میں بیٹھ کر صوفی صاحب نے اتنے مہینوں بعد پہلی بار اُس نیکی کو عذاب سمجھا جسے کرنے کے بعد کئی ماہ سے وہ خود کو زمینی جنت میں محسوس کرتے رہے تھے۔

❁

حُسن آراء سے صوفی صاحب کی پہلی ملاقات مسجد میں ہوئی تھی۔ وہ اُس رات عشا کی نماز کے لئے گئے تھے۔ امام صاحب کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انہوں نے ہی جماعت کی امامت کروائی اور سب نمازیوں کے چلے جانے کے بعد اُس وقت مسجد کو بند کرنے ہی والے تھے جب اپنے عقب میں ایک نسوانی آواز سن کر وہ بے اختیار پلٹے۔

''امام صاحب؟''

وہ برقعے میں ملبوس تھی اور اُس نے نقاب سے اپنا سیاہ چہرہ چھپایا ہوا تھا صرف اُس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جو بے حد خوبصورت تھیں مگر اس وقت اُن میں

عجیب سی وحشت نظر آ رہی تھی۔

''امام نہیں ہوں بی بی ......''

''لیکن مجھے تو امام صاحب سے ملنا ہے۔''

آپ صبح آ جائیں۔

''میری زندگی میں کوئی صبح نہیں ہے''۔

اُس نے عجیب سے لہجے میں اُن سے کہا۔

''پھر آپ امام صاحب کے گھر چلی جائیں میں پتہ سمجھا......''

اُس نے اُن کی بات کاٹ دی۔

''میں اللہ کے گھر آئی ہوں اب کسی اور کے گھر نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے مسجد میں بیٹھنے دیں اور امام صاحب کو یہاں بلا لائیں''۔

صوفی صاحب اُس کے مطالبے پر قدرے حیران ہوئے مگر پھر انہوں نے مسجد کا دروازہ کھول کر اُسے اندر لے جاتے ہوئے بیٹھنے کا کہا۔ وہ خود امام صاحب کو بلانے کیلئے جانے لگے تو حُسن آراء نے اُنہیں روکا۔

''ذرا ٹھہریئے''۔

''جی؟''

صوفی صاحب نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔

''حرام موت اچھی ہے یا حرام کی زندگی؟''

وہ حُسن آراء کی بات پر ہکا بکا رہ گئے۔

''مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی''۔

صوفی صاحب نے اُلجھ کر کہا۔

''پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔ اُس نے اصرار کیا''۔

''دونوں نہیں ......کوئی تیسرا راستہ بھی تو ہو سکتا ہے''۔

صوفی صاحب نے سوچ کر کہا۔

''اور اگر نہ ہو تو؟''

اُس نے اسی انداز میں کہا۔

''راستے ''ہوتے'' نہیں ''ڈھونڈے'' جاتے ہیں''۔

''فرض کریں نہ ''ہو'' نہ ڈھونڈا جا سکتا ہو پھر؟''

''پھر بھی بی بی ...... میں نہ حرام موت کی حمایت کروں گا نہ حرام کی زندگی کی''۔

صوفی صاحب نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''آپ کی پریشانی کیا ہے؟ ......کوئی مالی مسئلہ ہے تو میں مدد کر سکتا ہوں آپ کی ...... اللہ نے بہت نوازا ہے مجھے''

صوفی صاحب نے کہا۔ ''میرے جیسی عورت کو ''مال'' کا مسئلہ نہیں ہوتا''۔

''آپ کے جیسی عورت ...... اس سے کیا مراد ہے آپ کی؟''

صوفی صاحب اُس کی بات پر اُلجھے۔

''اگر آپ وعدہ کریں کہ مسجد سے نہیں نکال دیں گے تو بتا دیتی ہوں''۔

حُسن آراء نے کہا۔

''میں مسجد سے نکالنے والا کون ہوتا ہوں یہ اللہ کا گھر ہے''۔

''میں طوائف ہوں''۔

اُس نے صوفی صاحب کی بات کاٹ کر کہا اور صوفی صاحب چند لمحوں کے لئے بول نہیں سکے۔ حُسن آراء چند لمحے اُن کے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر ایک گہرا سانس لے کر اُس نے کہا۔

''کچھ کہیں گے نہیں......؟''

پھر وہ ہلکا سا ہنسی

''میں جانتی ہوں بڑے بڑے لوگوں کو اسی طرح سانپ سونگھتے دیکھا ہے اس لفظ طوائف پر میں نے''۔

"مگر آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ ...... مجھے یقین ہے طوائف ہونا تو مسئلہ نہیں ہے آپ کا"۔

صوفی صاحب نے بالآخر کہا۔

"یہی تو مسئلہ ہے ...... کسی سے محبت ہوگئی مجھے ...... اُس کے ساتھ میں کوٹھے سے بھاگ گئی ...... کوٹھے پر آنے والے مرد "طوائف" سمجھ کر سر پر بٹھاتے تھے مجھے ...... میں "بیوی" بن کر کسی مرد کے پیروں میں بیٹھنا چاہتی تھی ...... پر اُس لڑکے کو محبت نہیں تھی مجھ سے ...... میں نکاح خواں کا انتظار کر رہی تھی وہ دلال لے آیا ...... میں بھاگ گئی ...... ریل کی پٹڑی پر جان دینا چاہتی تھی راستے میں یہ مسجد دیکھی ...... سوچا دنیا میں ہر گھر دیکھ لیا اب اللہ کا گھر بھی ایک بار دیکھ لوں"۔

"آپ نے ٹھیک کیا کہ یہاں آ گئیں"۔

صوفی صاحب کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔

"ہم لوگ مدد کریں گے آپ کی"۔

"پر میں یہاں مدد مانگنے نہیں آئی"۔

"حسن آراء نے اُن کی بات کاٹ دی"۔

"پھر؟"

وہ اُلجھے۔

"کوٹھے پر گاہک ملا۔ محبوب کے گھر پر دھوکہ ...... اللہ کے گھر عزت لینے آئی ہوں میں۔ اس محلے میں ہے کوئی جو میرے سر پر عزت کی چادر ڈال دے"۔

صوفی صاحب اُس کی بات پر ایک بار پھر چند لمحوں کے لئے بول نہیں پائے۔

"بی بی دل چھوٹا مت کریں میں اور امام صاحب آپ کے لئے کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے ...... آپ میرے گھر چلیں۔ وہاں میری بیوی اور بیٹی ہے ...... آپ وہاں رہیں"۔

"کس رشتہ سے میں آپ کے ساتھ چلوں؟ ...... باپ آپ میرے ہیں نہیں

...... بھائی میں آپ کو بناؤں گی نہیں اور شوہر آپ میرے بنیں گے نہیں"۔ صوفی صاحب اُس کی بات پر چونکے وہ عجیب عورت تھی۔

"نکاح کیوں نہیں کر لیتے آپ میرے ساتھ؟" اُس نے صوفی صاحب کے سر پر جیسے گرز دے مارا۔

"بی بی آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ...... میں ایسا آدمی نہیں ہوں"۔

صوفی صاحب نے ہڑبڑا کر کہا۔

"میں آپ کو کیا کرنے کو کہہ رہی ہوں ...... نکاح کرنے کو ...... طوائف کے منہ سے نکاح کی دعوت مذاق لگتی ہے یا گنا"۔

اُس نے تیکھے انداز میں کہا تھا۔

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا ...... میں ادھیڑ عمر آدمی ہوں ...... اپنی جوان بیٹی کا رشتہ ڈھونڈھ رہا ہوں ...... میں خود شادی کیسے کر سکتا ہوں"۔

صوفی صاحب نے وضاحت کی۔

"میری جگہ کسی اونچے خاندان کی عورت شادی کے لئے کہتی تو بھی انکار کر دیتے؟"

"بات اونچے یا نیچے خاندان کی نہیں ہے بات ضرورت کی ہے ...... مجھے دوسری بیوی کی ضرورت نہیں ہے"۔

"صوفی صاحب نے اُسے سمجھایا"۔

"لیکن مجھے تو ایک گھر کی ضرورت ہے"۔

"آپ میرے گھر ...... چل کر رہیں ...... مہمان کے طور پر جب تک چاہیں"۔

"مہمان نہ بنائیں میزبان بنائیں ...... مہمان بہت بنی ہوں میں ......"

"میرا اور آپ کا جوڑ مناسب نہیں"۔

"جانتی ہوں ...... آپ ایک متقی آدمی اور میں ایک گناہ گار عورت"۔

آپ پھر غلط سمجھ رہی ہیں میں اپنی اور آپ کی عمر کے فرق کی بات کر رہا

ہوں۔صوفی صاحب نے کہا۔

"میری عمر 40 سال ہے۔"

"وہ حُسن آراء کی بات پر اُلجھے"۔

"مگر آواز سے تو آپ ...... خیر آپ 40 کی بھی ہوں تو بھی بہت فرق ہے ...... میں 60 سال کا ہوں"۔

صوفی صاحب نے کہا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

"بی بی میں......"

حُسن آراء نے اُنہیں بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"اللہ کے گھر کھڑے ہیں اللہ کا واسطہ دوں گی تو بھی کیا شادی نہیں کریں گے۔میرے ساتھ؟"

حُسن آراء کی آواز کی نمی انہوں نے دیکھے بغیر بھی محسوس کی۔ پتہ نہیں صوفی صاحب کس بات سے پسیجے تھے اُس کے آنسوؤں سے یا پھر اللہ کے واسطے سے ......مگر اگلے ایک گھنٹے میں وہیں مسجد میں چار گواہوں اور امام صاحب کو بلوا کر انہوں نے حُسن آراء سے نکاح کر لیا تھا۔

حُسن آراء کو پہلی بار انہوں نے اپنے گھر پر تب دیکھا تھا جب اُس نے چہرے سے نقاب ہٹایا تھا۔صوفی صاحب کو جیسے غش آ گیا تھا۔ اُس نے اُن سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ حُسنہ کی عمر کی تھی ......کسی بھی طرح وہ 20-22 سے زیادہ کی نہیں تھی۔ وہ بے حد نادم اور شرمندہ ہوئے تھے مگر یہ شرمندگی اور ندامت صرف اُنہیں تک محدود تھی۔حُسن آراء اس رشتے سے بے پناہ خوش تھی اور اُسے اس جھوٹ پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ اُسے گھر چاہیے تھا اور اُس نے گھر ڈھونڈھ لیا تھا۔

وہ تین ماہ اس گھر میں رہی تھی مگر ان تین ماہ میں اُس نے صوفی صاحب کی اتنی خدمت اتنی اطاعت کی تھی کہ دلشاد کا 35 سال کا ساتھ کہیں پیچھے چلا گیا تھا۔صوفی صاحب شروع میں اُس کی کم عمری اور حالات کی وجہ سے اُس کا زیادہ خیال رکھتے تھے مگر

بعد میں اُن کا دل حُسن آراء کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ وہ بے انتہا خوبصورت تھی نوجوان تھی اور اُس کا "اخلاق" کمال کا تھا......

دلشاد اونچے خاندان کی تھی اور اسے اس بات کا گھمنڈ بھی تھا اور یہ گھمنڈ دلشاد بیگم کے طور طریقے میں کہیں نہ کہیں جھلک ہی جاتا تھا......

حُسن آراء کا کوئی خاندان نہیں تھا اور وہ سراپا اطاعت اور فرمانبردار تھی......کوئی قہر' کوئی زعم' کوئی گمان' کوئی ناز ...... وہاں کچھ بھی نہیں تھا......بس ایک سرشاری تھی ...... ایک ہی اطمینان تھا ...... وہ کوٹھے سے خاندان میں آ گئی تھی ...... اُس نے گھر بنا لیا تھا اور یہ بات وہ صوفی صاحب کو بار بار کہتی ...... اتنا ذکر کرتی کہ صوفی صاحب شرمسار ہو جاتے......

***

اور اب یک دم کیا ہو گیا تھا......اُنہیں آج لگ رہا تھا کہ وہ حُسن آراء کے ہاتھوں بے وقوف بنے تھے ...... بہت بُری طرح بے وقوف ...... آخر ایک نوجوان لڑکی ایک بوڑھے مرد میں کس لئے دلچسپی لے گی' کیوں اُس کے نکاح میں آنا چاہے گی......

وہ حُسن آراء سے بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر اُن میں حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اُس کا سامنا کر پاتے ......طلاق کے تین لفظ منہ سے نکالنے کے لئے صوفی صاحب کو بہت زیادہ ہمت چاہیے تھی ...... حُسن آراء اُن کے لئے صرف ایک احسان نہیں رہی تھی وہ اُن کے دل میں جگہ بنا بیٹھی تھی ...... اُسے گھر سے نکالنا اُسے دل سے نکالنے سے بہت آسان تھا......اور صوفی صاحب کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سا کام پہلے کریں ......اور کیا اُن میں سے کوئی کام کرنا اُن کے لئے ممکن ہے۔

***

حُسن آراء نے اُنہیں اس تکلیف سے بچا لیا تھا۔ اگلی صبح حُسنہ اکبر کے ساتھ روتی دھوتی صوفی صاحب کے گھر آئی اور اُنہیں بتایا کہ پچھلی رات حُسن آراء اور اکبر نے گھر سے بھاگ جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اکبر نے حُسن آراء کو حُسنہ کا سارا زیور لا کر

دے دیا۔ حُسن آراء نے اُس سے کہا تھا کہ وہ صبح فجر کے وقت چھت پھلانگ کر اکبر کی چھت پر آ جائے گی اور پھر وہ دونوں صبح صبح کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے اور وہاں شادی کر لیں گے۔

فجر کے وقت وہ دونوں ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ حُسن آراء نے اکبر کو ٹکٹ لانے کے لئے بھیجا' جب وہ ٹکٹ لے کر آیا تو حُسن آراء اُس جگہ موجود نہیں تھی جہاں وہ اُسے چھوڑ کر گیا تھا اکبر حواس باختہ ہو کر اُسے ڈھونڈتا رہا' مگر وہ نہیں ملی اور تب اُسے اپنی حماقت کا احساس ہوا وہ اُسے بے وقوف بنا کر خود شاید کسی تیسرے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

اکبر پچھتاتا ہوا گھر آیا تھا اور اُس نے حُسنہ کو سب کچھ بتاتے ہوئے اُس سے معافی مانگ لی تھی ...... حُسنہ اب اُسے ساتھ لے کر صوفی صاحب سے معافی منگوانے کے لئے آئی تھی۔

دلشاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ ہنسے یا روئے۔

اکبر اب منہ بھر بھر کر حُسن آراء کی برائیاں کر رہا تھا اور حُسنہ کی تعریفیں کر رہا تھا...... ساتھ ساتھ صوفی صاحب سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا...... وہ کانٹا جو دلشاد اور حُسنہ کی زندگی میں گڑا تھا وہ نکل گیا تھا۔ مگر دوسری طرف حُسنہ کا وہ سارا زیور بھی چلا گیا تھا جو اُسے شادی پر میکے اور سسرال کی طرف سے پہنایا گیا تھا۔

''معاف کر دیں صوفی صاحب اسے ...... صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے اور پھر غلطی تو آپ کی تھی ...... آپ ایسی عورت کو گھر لائے کیوں جس کی وجہ سے ہماری عزت گئی''۔

دلشاد نے صوفی صاحب سے اکبر کی حمایت کرتے ہوئے کہا

صوفی صاحب خاموش ہو رہے' کہنے کو اب کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا...... حُسن آراء اُن کا گھر نہیں اُن کا دل خالی کر گئی تھی مگر اُنہیں شکوہ اللہ سے تھا...... انہوں نے اللہ کے گھر اُس کے سر پر عزت کی چادر ڈالی تھی پھر وہ اُن کے گھر کی عزت کیسے لے گئی؟

''ابا کہاں ہیں اماں؟''

حُسنہ نے دلشاد سے پوچھا۔ وہ کئی دنوں کے بعد گھر آئی تھی''۔ مسجد میں ہوں گے اور کہاں ہوں گے جب سے وہ خرافہ گئی ہے ہر وقت مسجد میں ہی پڑے رہتے ہیں ...... پر یہ بھی اچھا ہے کہ مسجد میں ہی پڑے رہتے ہیں ...... پہلے کی طرح کوٹھے پر جاتے تو ......

''دلشاد نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے حُسنہ کے ہاتھ میں پکڑی پوٹلی کو حیرت سے دیکھا''۔

اس پوٹلی میں کیا ہے؟

''میرا زیور ہے''۔ حُسنہ نے مدھم آواز میں کہا۔

''دلشاد چونکی''۔

کیسا زیور......؟ تمہارا زیور تو وہ خرافہ لے گئی تھی۔

''اماں گالی مت دیں اُسے''۔ حُسنہ نے اس بار جیسے بے اختیار تڑپ کر کہا۔

''خبردار اب کے حمائت کی اُس کی تو''۔ دلشاد کو جیسے آگ لگ گئی۔

''غضب خدا کا یہ سب ہو گیا اور پھر بھی تم نے سبق نہیں سیکھا...... اور یہ کون سا زیور ہے جس کی بات کر رہی ہو تم؟''

حُسنہ نے جواب دینے کی بجائے بستر پر پوٹلی اُلٹ دی۔ دلشاد ساکت رہ گئی۔ وہ واقعی حُسنہ کا شادی کا زیور تھا۔

''یہ کیا؟ ...... یہ ...... یہ کہاں سے آیا؟''

وہ اٹکیں

''اپنے کمرے میں یہیں چھوڑ گئی تھی وہ جانے سے پہلے''۔

حُسنہ نے سر جھکائے مدھم آواز میں کہا۔ ''زیور چھوڑ گئی عزت لے گئی''۔

دلشاد نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

''نہ زیور لے کر گئی نہ عزت ...... وہ نہ آتی تو اس گھر کی عزت جاتی''۔

"تو کیا کہہ رہی ہے حُسنہ ......؟" دلشاد نے پہلی بار حُسنہ کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی سسک رہی تھی۔ اُن کے دل کو کچھ ہوا۔ آخر بات کیا تھی؟......

اور "بات" نے اُنہیں "بات کرنے" کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

"میرے تعلقات ہو گئے تھے اماں اکبر کے ساتھ...... ہم لوگ چھت پر ملتے تھے...... میں سوچتی تھی وہ اس طرح رشتہ نہیں بھیج رہا شاید میں اس کی بات مان لوں تو اسی طرح رشتہ بھیج دے......لیکن اکبر کو یہ پتہ چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو وہ مجھ سے کترانے لگا اُس نے چھت پر آنا چھوڑ دیا۔ میں اتنی پریشان تھی کہ ایک دن چوہے مار گولیاں کھا کر مرنے والی تھی جب حُسن آراء نے مجھے بچایا۔

پھر میں نے اُس کو سب کچھ بتا دیا۔ اُس نے مجھے کہا کہ وہ اکبر کو پھانس کر مجھ سے شادی پر مجبور کرے گی۔ اور اُس نے ایسا ہی کیا۔

پر ہماری شادی ہو جانے کے بعد بھی اکبر حُسن آراء کو اور زیادہ تنگ کرنے لگا تھا۔ پھر حُسن آراء نے مجھ سے کہا کہ وہ ابا کی بیوی ہے اب گناہ نہیں کرے گی اور اکبر اُسے یہ دھمکی دے رہا تھا کہ اگر وہ اُس کی بات نہیں مانے گی تو وہ مجھے چھوڑ دے گا......

پھر ہم دونوں نے مل کر کھیل کھیلا...... آپ کو اُس دن میں نے جان بوجھ کر وہاں بھیجا تھا مجھے پتہ تھا آپ ابا کو لے کر آ جائیں گی۔

حُسن آراء کو ڈر تھا ابا اُسے طلاق دے دیں گے تو اکبر اُس کے پیچھے آئے گا اور شاید مجھے بھی طلاق دے دے...... اس لئے اُس نے اکبر کے ساتھ یہ دھوکہ کیا تاکہ وہ اُس سے نفرت کرنے لگے اور اُسے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرے بلکہ میرے ساتھ خوش رہے"۔

حُسنہ نے سب کچھ بتانے کے بعد سسکیاں لیتے ہوئے سر اُٹھا کر دلشاد کو دیکھا جس نے اب تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

وہ پتھر کے بُت کی طرح بیٹھی تھی۔ اُس کے ہونے والے بچے کے لئے

موزے بُننے والی سلائیاں اُس کے ہاتھوں سے گر چکی تھیں...... اور اِس کے ساتھ ہی خاندانی نجابت پر اُن کا فخر اور غرور بھی......

مات ہوئی بھی تھی تو کس کے ہاتھوں...... "خاندانی عورت" جیسے منہ کے بل گر گئی تھی......

"اُس نے ......اُس نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟" حُسنہ کو دلشاد کی آواز کسی کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"پوچھا تھا میں نے ......

وہ کہتی تھی ابا کا کوئی احسان تھا اُس کے سر پر...... وہ احسان اُتارنا نہیں چاہتی ...... پر احسان کرنا ضرور چاہتی ہے"۔

دلشاد زرد چہرے کے ساتھ اپنی اِس اکلوتی اولاد کا چہرہ دیکھتی رہی...... جسے اُس نے خاندانی شرافت و نجابت کی گھٹی دے کر پالا تھا اور جس نے اُن کے منہ پر کالک مل دی تھی...... وہ حُسنہ سے کیا کہتی...... وہ حُسن آراء سے بھی کیا کہتیں...... یہ کہ وہ "طوائف" کے بھیس میں "خاندانی" نکلی جو صوفی صاحب اور دلشاد کی عزت پر پردہ ڈال کر چُپ چاپ اُن کی زندگی سے چلی گئی تھی......

بمشکل اپنے پیروں پر زور ڈالتے ہوئے وہ پلنگ سے اُٹھی تھیں۔

"اماں"۔......"اماں"

حُسنہ نے بے تاب ہو کر اُنہیں پکارا۔ دلشاد نے پلٹ کر اُسے نہیں دیکھا...... اُنہیں اس وقت اپنی بیٹی ......"اپنی" نہیں لگ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر انہوں نے باہر جانے کے لئے قدم بڑھایا اور ہِل نہیں سکیں۔ صوفی صاحب سامنے کھڑے تھے پتہ نہیں وہ کب آئے تھے مگر اُن کے چہرے اور آنکھوں کی رنجیدگی نے دلشاد کو بتا دیا تھا کہ کوئی بھید اب بھید نہیں رہا تھا۔ بہت دیر تک دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے پھر دلشاد نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔

"اُس پر آپ نے کیا احسان کیا تھا صوفی صاحب؟"......

صوفی صاحب بہت دیر دلشاد کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

''یہی تو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں نے اُس پر کیا احسان کیا تھا؟ ......احسان کیا بھی تھا کہ......صوفی صاحب بات مکمل نہیں کر سکے۔ دلشاد اپنے دوپٹہ سے منہ ڈھانپ کر یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔''

اب میرا انتظار کر

17 جنوری

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

تمہاری شادی کے بعد انگلینڈ سے بھیجا ہوا تمہارا پہلا خط مجھے آج ہی ملا ہے۔ فاصلے دلوں کے رابطوں کو اور مضبوط کر دیتے ہیں۔ یہ تم نے ہی کہا تھا ناں (کاش ایسا نہ ہوتا) سات سال کی طویل دوستی کے بعد اب تم اتنی دور جا بیٹھی ہو کہ مجھے اپنے اردگرد کے لوگوں میں تمہارے جیسا چہرہ تلاش کرنے میں بہت دیر لگے گی۔ (شاید مجھے کبھی بھی تمہارے جیسا کوئی دوسرا نہ ملے)

پتا نہیں مجھے یہ احساس کیوں ہونے لگا ہے کہ میں آہستہ آہستہ سب کچھ کھو دوں گی۔ کچھ پہلے کھو دیا۔ کچھ اب کھو رہی ہوں جو باقی بچا ہے وہ بھی کب تک رہے گا۔ پھر خالی ہاتھ اور خالی دل کے ساتھ میں کہاں جاؤں گی۔ اب تو رونے کے لیے تمہارا کندھا بھی نہیں ہے۔ نہیں پریشان مت ہونا۔ میں رو نہیں رہی ہوں۔ کوشش کر رہی ہوں۔ تمہاری ہدایات پر عمل کرنے کی اور تم سے کیے ہوئے وعدہ نبھانے کی۔

تم نے خط میں پوچھا تھا۔ میں کیسی ہوں۔ کیوں مریم تم نے ایسا کیوں لکھا' پہلے تو کبھی تم نے اپنے کسی خط میں مجھ سے میرا حال نہیں پوچھا پھر اب کیوں؟ کیا تمہیں لگ رہا ہے کہ...... میں ٹھیک ہوں میں اچھی ہوں بہت ہی خوش ہوں' اتنی ہی خوش ہوں جتنا آج کے دور میں میری جیسی لڑکی ہو سکتی ہے۔

اپنے خط میں یہ مت پوچھنا کہ میرے جیسی سے تمہاری کیا مراد ہے۔ میری باتیں تمہیں ابنارمل لگ رہی ہیں' میں واقعی آج کل ابنارمل ہو رہی ہوں۔ تم نے کبھی دلدل میں پھنسے ہوئے شخص کو دیکھا ہے۔ کیسے ہاتھ پاؤں مارتا ہے وہ۔ کوئی رشتہ' کوئی اثاثہ' کوئی دولت بچانے کے لئے نہیں بس ایک جان بچانے کے لیے۔ میں بھی پچھلے کئی سالوں سے ایک دلدل میں پھنسی ہوئی ہوں' بس فرق یہ ہے کہ میں' میں ہاتھ پاؤں نہیں مار رہی ہوں۔ جان بچا کر آخر کرنا ہی کیا ہے۔ میرا خط پڑھتے ہوئے رونا مت شروع کر دینا۔ میں تمہیں پریشان کرنے کے لیے یہ سب کچھ نہیں لکھ رہی ہوں۔ تمہیں پتا ہے مجھے اکثر ڈپریشن کے دورے پڑتے ہیں۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہیں بھاگ جاؤں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی پہاڑ پر جا بیٹھوں خاموشی میں سناٹے میں اور پھر روؤں زور زور سے دھاڑیں مار مار کر۔ اور میری ہر سسکی' ہر آہ' ہر چیخ پہاڑوں میں گونج بن کر پھرتی رہے۔
(کیا اشفاق احمد اور بانو قدسیہ اس سے زیادہ فلاسفی لکھ سکتے ہیں)

یہ جان کر سکون مل رہا ہے کہ تم ناصر کے ساتھ بہت خوش ہو۔ لیکن مریم! تم ناصر کے ساتھ ہی نہیں کسی بھی شخص کے ساتھ خوش رہ سکتی تھیں۔ تمہیں خدا نے میرے جیسے روگ نہیں دیئے۔ تم نے لکھا ہے ناصر بہت اچھا ہے۔ تمہارا بہت خیال رکھتا ہے۔ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ میری دعا ہے۔ تم ہمیشہ اپنے ہر خط میں یہی تین جملے لکھتی رہو۔ ان میں کبھی تبدیلی نہ آئے۔ ہاؤس جاب چھوڑ کر تم نے اپنے والدین کی خوشی کے لیے اپنا کیریئر قربان کر دیا ہے۔ تمہیں اتنا اجر تو ملنا ہی چاہیے کہ جس شخص کے ساتھ تمہاری شادی ہوتی' وہ تم سے محبت کرتا۔

تم نے میری روٹین اور مصروفیات کے بارے میں پوچھا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے کیا تمہارے بغیر صرف ایک ماہ میں سب کچھ بدل گیا ہے۔ نہیں مریم! سب کچھ ویسا ہی ہے۔ بس خاموشی کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے' پہلے میرے اندر ہی تھی۔ اب آہستہ آہستہ میرے اردگرد بھی پھیلنے لگی ہے۔ ہاسپٹل سے آنے کے بعد کافی کا مگ لے کر اب میں اکیلی اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہوں۔ (پہلے تو تم بھی ساتھ ہوتی تھیں) پھر مجھے بہت کچھ یاد آتا رہتا ہے لیکن میں خاموشی سے کافی کے سپ لیتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکتی

رہتی ہوں۔ (پہلے میں سب کچھ تم سے کہا کرتی تھی)

میں اب اپنا کمرہ کسی سے شیئر نہیں کر سکتی۔ میں تمہاری جگہ کسی کو نہیں دے سکتی۔ ساری شام اس کھڑکی میں اسی طرح گزار دیتی ہوں۔ پھر رات آ جاتی ہے۔ اور اس شخص کی یاد کے ساتھ اب تمہاری یاد بھی شامل ہو گئی ہے۔

بس ایک سال باقی ہے پھر میرے پر کاٹ کر مجھے بھی قفس میں بند کر دیا جائے گا اور مریم! میری دعا ہے۔ یہ سال اتنا لمبا ہو جائے کہ کبھی ختم ہی نہ ہو مگر میرے کہنے سے وقت کی رفتار نہ بڑھے گی نہ تھمے گی اور ایک سال بعد جب میں اپنے خوابوں اور خواہشوں کے تابوت میں آخری کیل گاڑ کر واپس لوٹ جاؤں گی تو تم آنا' سیدہ درمکنون علی عباس رضوی کو دیکھنے...... روحانی طور پر بیمار مسیحا کو جسمانی شفا بانٹتے ہوئے۔ مریم! سال میں تین سو پینسٹھ دن کیوں ہوتے ہیں تین ہزار تین سو پینسٹھ کیوں نہیں۔

مجھے خط لکھتی رہنا۔ کم از کم اس سال تو۔ پھر جب واپس اپنے گاؤں چلی جاؤں تو مجھے کوئی خط نہ لکھنا۔ پھر شاید میں کسی رابطے کے قابل نہ رہوں۔ میں مایوس نہیں ہو رہی۔ حقیقت کو تسلیم کرنا سیکھ رہی ہوں۔ تم ہی نے ایک دفعہ کہا تھا نا۔ ''درمکنون تمہارا مسئلہ حالات نہیں تمہارا رومانٹسزم ہے۔'' خوش ہو جاؤ مریم رومانٹسزم ختم ہوتا جا رہا ہے۔

درمکنون

20 فروری

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

اپنے خط میں اتنی نصیحتیں اور ہدایات مت لکھا کرو۔ میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ ساری زندگی مجھے نصیحتوں اور ہدایات کے علاوہ دیا ہی کیا گیا ہے۔ اب تم بھی وہی سب کچھ کرنے لگی ہو جو میرے ماں باپ ہمیشہ سے کرتے آ رہے ہیں۔

بار بار خوش رہنے کا کہتی ہو۔ تم بھی تو ڈاکٹر ہو۔ خوش رہنے کے لیے کوئی نسخہ کیوں نہیں تجویز کرتیں یا پھر کوئی دوائی بھیج دو۔ انگلینڈ سے خوشی کے لیے جس کے تین ڈرا

پس مجھے خوشی سے مالا مال کر دیں اور اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو بس پھر خوش رہنے کے لیے مت کہا کرو' یہ بھی میرے بس میں نہیں۔

تمہاری بھیجی ہوئی چیزیں مجھے مل گئی ہیں مگر اب دوبارہ کچھ مت بھیجنا۔ تم جانتی ہو مریم! یہ سب چیزیں میرے لیے بے کار ہو چکی ہیں مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہارے تحریر کیے ہوئے چند لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کل بہت محتاج ہو گئی ہوں۔ ہر چیز' ہر بات کے لیے۔ لوگوں کو میری بات کا مفہوم سمجھنے میں بڑی دیر لگتی ہے۔ اور میں چاہتی ہوں۔ کوئی میری بات سمجھنے کی کوشش کرے ہی نہ۔ وقت کے ضیاع کے اور بھی تو طریقے ہوتے ہیں۔

''مریم! آج میں بہت روئی ہوں۔ تم جانتی ہو کیوں؟ ہاں تم ہی تو جانتی ہو۔ پتا ہے مریم آج پھر عاشر کا خط اور کارڈ آیا ہے۔ اس شخص کو جیسے ہر بات کی خبر ہوتی ہے۔ اسے تمہاری شادی اور انگلینڈ چلے جانے کا بھی پتا چل گیا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم سے جدائی میرے اعصاب پر کس طرح سوار ہو گئی ہے۔ اسے یہ بھی علم ہے کہ تنہائی میرے وجود کو کس طرح پگھلا رہی ہے اور میرا باپ کہتا ہے۔ محبت کوئی چیز نہیں اور میرا دل چاہتا ہے۔ میں اس کے سارے خط ان کے سامنے پھینکوں اور کہوں مجھے جاننا' مجھے سمجھنا ہے تو ان خطوں کو پڑھ کر جانیں۔ ان کو پڑھ کر سمجھیں اور پھر مجھے بتائیں۔ ان کی بیٹی درمکنون ان کو کیسی لگتی ہے۔ پتا نہیں ماں باپ کو یہ غلط فہمی کیوں ہوتی ہے کہ ان سے زیادہ ان کی اولاد کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی نہیں جانتا۔ حالانکہ انہیں تو کچھ بھی پتا نہیں ہوتا۔ انہیں ہی تو کچھ پتا نہیں ہوتا۔ انہیں تو صرف ہمارا وجود نظر آتا ہے۔ دو ٹانگوں' دو ہاتھوں' دو آنکھوں اور ایک دماغ والا وجود۔ وہ اسے ہی کُل سمجھتے ہیں یہ کُل کہاں ہے کُل تو دل ہے اور میرے دل تک ساری دنیا پہنچ سکتی ہے بس میرے ماں باپ نہیں پہنچ سکتے۔

پہلے زمانے کے لوگ اچھے تھے۔ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑ دیتے تھے۔ اب یہ کام آل رسول کرتی ہے مگر بیٹیوں کو جوان کرنے کے بعد۔

تم نے لکھا ہے۔ مایوس نہ ہو مایوسی کفر ہے مریم! کیا صرف مایوسی ہی کفر ہوتی ہے اور کوئی چیز نہیں؟ تمہارا کیا خیال ہے جو مایوس نہیں ہوتے۔ وہ پکے اور سچے مسلمان

ہوتے ہیں۔ کیا دوسروں کی آنکھوں کے خواب چھین لینا کفر نہیں ہوتا؟ کیا دوسروں کے دلوں کی خواہشات کو روند دینا کفر نہیں؟ اور مریم! بعض دفعہ مایوسی کفر سے بچا بھی تو لیتی ہے جیسے مجھے بچا رہی ہے۔ بعض دفعہ آسوں' امیدوں کا ختم ہو جانا بھی بڑی نعمت ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ تم اس پیراگراف کو تین دفعہ پڑھو گی اور تمہیں وہ بات سمجھ میں آ جائے گی جو میں نے نہیں لکھی۔

''مریم! تم ...... تم خدا کے لیے عاشر سے کہہ دو مجھے خط نہ لکھے۔ مجھے کارڈ نہ بھیجے۔ میری جان چھوڑ دے اس سے کہو سوچ لے کہ درمکنون مر گئی ہے مان لے کہ درمکنون کبھی تھی ہی نہیں۔ اور بس مجھ سے کوئی رابطہ نہ کرے۔ تم تو کہہ سکتی ہو اس سے۔ مریم تم تو سمجھا سکتی ہو۔ تم اس کے شہر میں ہو۔ اس کے پاس ہو۔ اس سے کہو۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ اپنی زندگی تباہ نہ کرے۔ اسے تو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ مریم! تم ایک بار عاشر سے ملو۔ یہ مشکل کام تو نہیں ہے۔ ایک بار میری خاطر اس سے ملو۔ شاید تم اسے وہ سب کچھ سمجھانے میں کامیاب ہو جاؤ جو میں نہیں سمجھا سکتی۔ جو کوئی دوسرا نہیں سمجھا پایا۔

پتا ہے' اس بار اس نے اپنے خط میں کیا لکھا ہے۔ اس نے لکھا ہے۔

''درمکنون! تمہیں یہ غلط فہمی کیوں ہے کہ تم میرے بغیر خوش رہ سکتی ہو۔ خوشی تو دور کی بات ہے۔ تم تو زندہ بھی نہیں رہ پاؤ گی؟۔''

اور لوگ کہتے ہیں دلوں کے بھید صرف اللہ جانتا ہے' ہے نا مریم! لوگ پھر بھی یہی کہتے ہیں۔ اور میرا دل چاہتا ہے مریم! میں عاشر سے کہوں کہ وہ میرے وجود پر پڑی ہوئی فریب اور ڈھکوسلے کی چادر کو یونہی پڑا رہنے دے۔ یہ خود فریبی جب تک ہے۔ میں ہوں اور جب یہ نہیں ہو گی تو......

وہ اپنے ہر خط میں پتا نہیں کون کون سے اسکالرز کے ریفرنسز دیتا رہتا ہے۔ اسے لگتا ہے' وہ اس طرح مجھے قائل کر لے گا۔ مریم میں کب قائل نہیں ہوں۔ وہ کوئی دلیل کوئی ریفرنس نہ دے تب بھی میں جانتی ہوں۔ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن وہ۔ وہ کیوں میرے پاؤں میں پڑی بیڑیوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ چاہتا ہے۔ میں بغاوت کروں۔ میں لڑوں۔ اپنا حق مانگوں۔ اسے نہیں پتا' سیدزادیوں کے کوئی حق ہوتے ہی نہیں۔ پھر حق مانگنے اور لینے کا

سوال کہاں سے آتا ہے؟ تمہیں یاد ہے نا وہ کتنا Optimistic (خوش امید) ہوا کرتا تھا۔ وہ اب بھی ویسا ہی ہے اس کا خط کسی بھی لڑکی کو بغاوت پر آمادہ کرسکتا ہے۔ کسی کو بھی ہپناٹائز کرسکتا ہے۔ مگر میں...... میں تو سید زادی ہوں۔ مجھے خوف آتا ہے مریم! کہیں میرا Pessimism (قنوطیت) اس کے Optimism (رجائیت) کو نہ لے ڈوبے پھر وہ اپنی زندگی کیسے گزارے گا۔ دنیا کو میری طرح کالے شیشے کی عینک پہن کر دیکھنا۔ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اور میں نہیں چاہتی۔ یہ تکلیف کبھی اس کی زندگی میں آئے پھر بھی مریم میں کچھ نہیں کرسکتی۔ محبت اس کا قصور تھی میں نے اس سے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرو۔ یہ سب اس نے اپنی مرضی سے کیا تھا۔

اس وقت بھی مجھے اس کھڑکی سے باہر کھڑے دو گارڈز نظر آرہے ہیں جو میری ''حفاظت'' کے لیے ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ کس قدر اہم ہوں میں مریم! کس قدر اہم ہوں میں اپنے ماں باپ اپنے خاندان کے لیے۔ مریم حفاظت اور نگرانی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کیا تم کو پتا ہے۔ مجھے پتا ہے تم نے فلمز میں اکثر تیروں کو جسم چھلنی کرتے دیکھا ہوگا۔ کبھی کسی چہرے کو تیروں سے چھلنی ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

اگر کبھی دیکھنے کی خواہش ہوئی تو میرا چہرہ دیکھنا۔ جو لوگ آپ کی حفاظت کر رہے ہوں، وہ تو آپ کے اردگرد موجود اور آپ کے ملنے والے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر میرے محافظ مجھ سے ملنے والے ہر شخص کا چہرہ پڑھنے کے بجائے میرا چہرہ پڑھتے ہیں۔ (انہیں احکامات پر عمل کرنا ہے) اور تب مریم! تب مجھے یوں لگتا ہے جیسے ایک کے بعد ایک سنسناتا ہوا تیر میرے چہرے میں ترازو ہو جاتا ہے اور میرا چہرہ مسخ ہوتا جاتا ہے اور میں چیخنے چلانے رونے کے بجائے ہنستی ہوں۔ مسکراتی ہوں۔ کیا اس سے زیادہ اذیت ناک چیز کوئی اور ہوسکتی ہے مریم؟

میں اگر سلیپنگ پلز نہ لوں تو شاید اب کبھی سو نہ سکوں۔ لیکن پتا نہیں مریم! اب یہ گولیاں بھی بے اثر ہوتی جارہی ہیں۔ ہر گزرنے والے ہفتے کے ساتھ مجھے ان کی ڈوز ڈبل کرنی پڑ رہی ہے ورنہ میں سو نہیں پاتی۔ مریم! میرے لیے دعا کیا کرو۔ مجھے اپنی دعا نہیں لگتی۔ شاید تمہاری لگ جائے۔ دعا کرو۔ مجھے سکون مل جائے دعا کرو۔ میرا دل دنیا میں

لگ جائے۔ دعا کرو۔ مجھے زندگی کے سارے پھندے اچھے لگنے لگیں۔ دعا کرو۔ اللہ کو کبھی بھول کر میرا خیال آجائے۔

خدا حافظ

تمہاری درمکنون

12 مارچ

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

یہ خط تمہیں گاؤں سے لکھ رہی ہوں۔ پچھلے چار دنوں سے یہیں ہوں اور یوں لگتا ہے۔ جیسے کسی جہنم میں ہوں۔ بس یہ جہنم بہت سرد ہے۔ یہ جسم کو کچھ نہیں کرتی۔ روح کو مار دیتی ہے۔ مجھے لگتا ہے مریم! میں مردہ روح والی ایک زندہ جسم ہوں۔

میں ساری عمر اسی گھر، اسی حویلی میں رہی ہوں۔ مگر پتا نہیں کیوں مریم! اب مجھے اس گھر سے بہت خوف آتا ہے اور اس خوف کا کوئی علاج نہیں ہے۔ مریم! مجھے بتاؤ۔ میں ساری عمر ان وسیع دالانوں، اونچے برآمدوں کے ساتھ کیسے رہوں گی؟ ان دیواروں کے ساتھ بیس سال بعد اکیلے باتیں کر کے زندگی کیسے گزاروں گی مگر...... مگر مجھے یہیں رہنا ہے۔

پچھلے چار دنوں سے پورے گاؤں کی عورتیں مجھ سے ملنے آرہی ہیں۔

انہیں میں بہت خاص ''ہستی'' لگتی ہوں۔ سید علی عباس رضوی کی پہلی اولاد جو دینی و دنیاوی دونوں علوم سے آراستہ ہے جسے اس لیے اہمیت حاصل ہے کیونکہ وہ اس خاندان کی پہلی لڑکی ہے جو اس طرح ڈاکٹر بننے کے لیے گاؤں سے باہر گئی اور جو اپنے باپ کی گدی سنبھالنے کے بعد روحانی کے ساتھ ساتھ جسمانی مسیحائی بھی کرے گی۔ مگر میں نہیں کروں گی۔

مریم! تم دیکھ لینا میں نہیں کروں گی۔ میں اگر اپنا گھر آباد نہیں کرسکتی تو حجرہ آباد کیوں کروں۔ اپنے دل، اپنی روح کو شفا نہیں دے سکتی تو لوگوں کے جسموں کو شفا کیوں دوں؟ میں اس گاؤں میں کوئی ہاسپٹل کھولوں گی نہ ڈسپنسری۔ میں اگر اپنے لیے کچھ

نہیں کر سکی تو کسی کے لیے بھی کچھ نہیں کروں گی۔ یاد ہے نا بابا نے مجھے اسی لیے ڈاکٹر بننے بھیجا تھا۔ بڑے لمبے چوڑے خواب دیکھے تھے۔ درمکنون لوگوں کی آنکھوں کے کانٹے اور سوئیاں نکال کر اپنی آنکھوں میں گاڑ لے۔ نام ہو' شہرہ ہو' ہر طرف سیدہ درمکنون علی عباس رضوی کی پاکیزگی' تقویٰ' خدمت' بے غرضی کا' نام ہو۔ سید علی عباس رضوی کے خاندان کا۔ لوگ کہیں یہ ہوتی ہیں سید زادیاں یہ ہوتی ہے آلِ رسولؐ جو اپنی زندگی خدمتِ خلق کے لیے تیاگ دیتی ہیں یہ ہوتا ہے ایثار۔ اس طرح مارتے ہیں نفس کو۔

مگر مریم! اگر میرے خواب اجڑے ہیں اگر مجھے خواہشوں کو نوچ کر پھینکنا پڑا ہے تو میں بھی بابا کے سارے خواب اسی طرح اجاڑوں گی۔ اب مقابلہ تقویٰ کا ہوگا۔ صرف تقویٰ کا۔ خدمتِ خلق کا نہیں۔ عاشر کا رشتہ ٹھکراتے ہوئے بابا نے مجھ سے کہا تھا۔

''ہم اہلِ سادات ہیں' آلِ رسولؐ ہیں۔ شجرہ نسب سات پشتوں تک دیکھتے ہیں۔ چاول کی کنی جتنا بھی کہیں شبہ ہو جائے تو رشتہ نہیں کرتے۔ تم اس شخص کو اپنے گھر کا رستہ دکھا آئی ہو جس کے خاندان کی سو پشتوں میں بھی کہیں سیدوں کا نام و نشان نہیں۔ تمہارے لیے خاندان میں کوئی رشتہ مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ شادی نہیں کروں گا میں تمہاری۔ تم کو میرے بعد میری گدی سنبھالنی ہے۔ اس علاقے میں خاندان کے نام کو قائم رکھنا ہے۔ تمہیں تعلیم اسی لیے دلوائی ہے تاکہ تم اپنے علم سے لوگوں کی خدمت کرو۔ اس لیے نہیں کہ تم اس طرح کے گھٹیا رشتے اپنے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاؤ۔ درمکنون! تم عام لڑکی نہیں ہو۔ سید زادی ہو۔ آلِ رسولؐ ہو۔ تم آسمان سے اتر کر پاتال میں کیوں جانا چاہتی ہو؟ تم دونوں بہنوں کو میں نے لڑکی نہیں لڑکا سمجھ کر پالا ہے۔ تم دونوں نے اس خاندان کے وقار میں اضافہ کرنا ہے۔ نام کرنا ہے۔ عزت بڑھانی ہے۔ ایسی آلائشوں کو آئندہ اس گھر کی دہلیز مت دکھانا۔''

ہاں مجھے یاد ہے۔ ان کی کہی گئی ہر بات حرف بہ حرف یاد ہے۔ ایک ایک کر کے انہوں نے ساری میخیں بڑی مہارت اور صفائی سے میرے وجود اور دل میں گاڑی تھیں مریم! بعض دفعہ یہ خاص ہونا کتنا عذاب ہوتا ہے۔ گلے میں طوق کی طرح پڑ جاتا ہے۔ پھر اترتا ہی نہیں۔ عورتیں میرے ہاتھ چومتی ہیں۔ اپنے بچوں کو میرے ہاتھوں سے شیرینی

کھلاتی ہیں۔ میرے پیروں میں بیٹھنا اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہیں۔ اور میرا دل چاہتا ہے۔ میں ان کے ہاتھ چوموں۔ میں ان سے کہوں میرے سر پر ہاتھ پھیرو۔ میرے لیے دعا کرو۔ ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ شوہر' بچے' گھر' آزادی۔ میرے پاس کیا ہے۔ صرف نام۔ ایک لمبا چوڑا نام۔ جو لوگوں کی گردنیں جھکا دیتا ہے پھر وہ مجھے اپنے جیسا انسان سمجھتے ہی نہیں۔ میرا دل چاہتا ہے مریم! میں ان کے سامنے روؤں۔ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ جاہل اور کمی کمینوں کی طرح زمین پر بیٹھ کر بلند آواز میں اپنے سارے دکھڑے روتے ہوئے سناؤں۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر بولوں۔ گندے چیتھڑے پہنے ہوئے جو دل میں آئے۔ میں کہتی جاؤں۔ کسی دوسرے کو بولنے ہی نہ دوں۔ صرف اپنی کہوں صرف اپنی کہوں۔ مگر مریم! مجھے ایک مجسمے کی طرح اونچے پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے خاموش بیٹھنا ہوتا ہے۔ صرف سننا ہوتا ہے۔ دوسروں کی تکلیفیں' پریشانیاں' بیماریاں اور پھر اتنی دھیمی آواز میں بولنا ہوتا ہے جو خود میرے کانوں تک بھی نہ پہنچے۔ بس ان تک پہنچے جنہوں نے سوال کیا ہے۔ جنہوں نے پوچھا ہے۔ مجھے صرف تسلی اور دلاسا دینا ہوتا ہے۔ صبر کی تلقین کرنی ہے' اچھے وقت کی امید دلانی ہوتی ہے اور پھر دعا کی یقین دہانی کروانی ہوتی ہے۔ مریم! یہ سب کتنا مشکل ہوتا ہے یہ تم نہیں جانتیں۔ صرف میں جانتی ہوں۔ صرف میں' وجود کے اندر اٹھتے طوفانوں کے ساتھ خود کو برف کی سل بنا کر پیش کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ سب کو پتا نہیں۔

آج ایک عورت اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر میرے پاس آئی تھی۔ دعا کروانے۔

''اس بے ہدایتی کے لیے دعا کریں بی بی! یہ گمراہ ہو گئی ہے۔ ہماری مرضی سے شادی نہیں کرتی۔ اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ ہم نے بچپن سے اس کا رشتہ طے کر رکھا ہے۔ ہم تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس گمراہ کو سمجھائیں بی بی! اس کو عقل دیں' بتائیں اسے۔ ماں باپ کا کتنا درجہ ہوتا ہے۔ وہ منہ پھیر لیں تو رب بھی ناراض ہو جاتا ہے اور سکھ بھی نہیں ملتا۔''

اس لڑکی کی ماں نے آتے ہی اپنی داستان شروع کر دی تھی۔ میں چپ بیٹھی اس سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی کا چہرہ دیکھتی رہی۔ جو اپنی میلی چادر کے پلو سے بار بار آنکھوں کو پونچھ رہی تھی۔ کچھ دیر میں اسے دیکھتی رہی اور پھر میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔

میں نے اس لڑکی کو بری طرح لعنت ملامت کی تھی (اگر حاکم کا دل اجڑا ہوا ہے تو رعایا کو کیا حق ہے دل بسانے کا) وہ لڑکی چپ چاپ آنسو بہاتے ہوئے سر جھکائے سب کچھ سنتی رہی تھی۔

جب عاشر نے اپنا رشتہ بھیجا تھا تو میں نے بھی اسی طرح بابا کی باتیں سنی تھیں۔

تب مجھ پر بھی کسی کو ترس نہیں آیا تھا۔ پھر وہ عورت مجھے دعائیں دیتی ہوئی اپنی بیٹی کو لے گئی اور مریم! مجھے ...... مجھے اسی طرح لوگوں کے دل اجاڑ کر دعائیں لینی ہیں۔ نام رکھنا ہے۔ رتبہ بڑھانا ہے۔ عزت قائم رکھنی ہے۔ آخر سیدہ درمکنون علی عباس رضوی کوئی معمولی لڑکی تو نہیں ہے۔ (اب تو یہ جملہ بھی مجھے ایک زہریلا سانپ لگتا ہے)

تمہارا خط مجھے ابھی نہیں ملا۔ ہوسکتا ہے لاہور پہنچ چکا ہو۔ میری عدم موجودگی میں۔ میں پچھلے خط کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی تمہیں خط لکھ رہی ہوں نہ لکھتی تو آج شاید میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا۔ مجھے اپنے اردگرد پھرنے والے لوگ کچھ اتنے ہی برے لگ رہے ہیں۔

تم خوش تو ہونا مریم؟ میری دعا ہے۔ تم بہت بہت خوش رہو۔

خدا حافظ

تمہاری

درمکنون

22 اپریل

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

میں جانتی تھی مریم! وہ تمہاری کوئی بات' کوئی نصیحت نہیں سنے گا پھر بھی پتا نہیں کیوں میں نے تمہیں اس سے ملنے کے لیے کہا۔ اسے سمجھانے کے لیے کہا۔ تمہارے خط میں لکھی ہوئی باتوں سے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ پتا نہیں اس شخص کو یوں بے مراد رہنے کا کیا شوق ہے؟ اسے تو کوئی مجبوری نہیں پھر وہ اپنی زندگی' اپنا مستقبل کیوں تباہ کرنا چاہتا ہے؟ یاد ہے نا اس نے اپنا رشتہ ٹھکرائے جانے پر مجھ سے کہا تھا۔

"درمکنون! جب تک تم اس زمین کے اوپر ہو۔ تب تک میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارے خاندان جتنی دولت نہ سہی لیکن بہرحال میرے پاس بھی دولت ہے۔ تمہارے جیسا نام ونسب نہ سہی لیکن کسی عام خاندان سے میں بھی تعلق نہیں رکھتا۔ خوبصورت ہوں' تعلیم یافتہ ہوں اور تم...... تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو پھر میں کیا صرف اس وجہ سے ٹھکرا دیا جاؤں گا کہ سید نہیں ہوں۔ اہل سادات میں سے ہونا میرے بس میں تو نہیں پھر مجھے کس چیز کی سزا ملی؟ درمکنون! میں تمہیں مظلوموں کی فہرست میں شامل نہیں ہونے دوں گا۔

تمہارے باپ نے کہا ہے۔ ہم بیٹیوں کو خاندان سے باہر بیاہنے کے بجائے کنوارا بٹھائے رکھنا بہتر سمجھتے ہیں مگر میں تمہیں ایسی کسی صلیب پر چڑھنے نہیں دوں گا۔ میں نے پچھلے تین سال سے تمہارے اور اپنے حوالے سے بے شمار خواب دیکھے ہیں اور مجھے اپنی آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں سجانے کا کوئی شوق نہیں ہے نہ ہی میں تمہیں کسی مزار کی نام نہاد متولی بننے دوں گا۔ یہ تمہاری اپنی زندگی ہے درمکنون! تمہیں اسے اپنے طریقے سے گزارنے کا مکمل حق اور اختیار ہے۔ اپنے گلے مین رسوم وعقائد کا پھندا ڈال کر خودکشی مت کرو۔"

مریم اس نے ایک بار بھی مجھے ملامت نہیں کی تھی۔ ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ جب تم جانتی تھیں کہ تمہارا باپ تمہیں صرف اپنے ہی خاندان کے کسی سید سے بیاہے گا تو پھر تم نے تین سال تک مجھے فریب کیوں دیئے رکھا۔

جب تمہیں معلوم تھا کہ تم نے اپنے باپ کی گدی سنبھالنی ہے تو پھر تم میرے ساتھ مستقبل کی پلاننگ کیوں کرتی رہیں۔

جب تمہیں پتا تھا کہ تمہارا باپ میرا رشتہ بری طرح ٹھکرائے گا تو تم نے مجھے رشتہ بھیجنے سے کیوں نہیں روکا؟

مریم! اس نے ایک بار بھی مجھ سے یہ سب نہیں کہا۔ میں منتظر تھی کہ وہ کچھ کہے۔ کوئی شکوہ کرے۔ اس طرح کی کوئی بات تو کرے۔ مگر اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔

مریم! محبت واقعی دل کو بہت بڑا کر دیتی ہے۔ تب اس کے لفظ میرے وجود پر موم کے قطروں کی طرح گر رہے تھے۔ کچھ جلن' کچھ اضطراب کچھ بے چینی ہوتی اور پھر

سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ ہاں مگر اس کے لفظ موم کے ٹھنڈے قطروں کی طرح آج بھی میرے دل سے چپٹے ہوئے ہیں۔

میں جانتی ہوں میں نے اس سے دھوکا کیا۔ اسے فریب دیا مگر فریب تو میں نے اپنے آپ کو بھی دیا تھا۔ دھوکا تو اپنے وجود سے بھی کیا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ہمارے خاندان میں شادیاں باہر نہیں ہوتیں۔ (کسی غیر سید کی تو بات ہی کیا) میں اپنے آپ کو اس خوش فہمی سے بہلاتی رہی کہ میں بابا سے اپنی باقی ساری باتوں کی طرح یہ بات بھی منوالوں گی آخر اس میں مشکل ہی کیا ہے مگر مریم! رسوم و رواج کے سامنے رشتے اور محبت کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہم نے اپنے وجود کو اتنی اونچی اونچی فصیلوں میں قید کر لیا ہے کہ اب چاہیں بھی تو روشنی ہم تک پہنچ نہیں پاتی۔

مریم! کاش میں عاشر عثمان سے کبھی نہ ملی ہوتی کاش میں نے اسے کبھی نہ دیکھا ہوتا۔

وہ میڈیکل کالج میں مجھ سے تین سال سینئر تھا پھر بھی پتا نہیں کیوں پورے کالج میں مجھے وہی ایک ایسا چہرہ نظر آیا تھا۔ جس سے مجھے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ ہمارے پروفیسر ڈاکٹر عثمان مکرم کا بیٹا تھا۔

تمہیں یاد ہے۔ اس سے میری پہلی ملاقات تمہارے ساتھ ہی سر عثمان مکرم کے گھر ہوئی تھی پھر آہستہ آہستہ اس سے جان پہچان بڑھتی گئی تھی۔ کالج میں اکثر وہ تم سے ملتا کیونکہ تمہارے ابو ڈاکٹر عثمان کے بہت اچھے دوست تھے۔ میں تمہارے ساتھ ہوتی' اس لیے مجھ سے بھی اس کی بات چیت ہوتی رہتی۔ تب ہی مجھے یوں لگنے لگا جیسے کچھ غلط ہو رہا ہے۔ مجھے لاشعوری طور پر اس کے انتظار کی عادت پڑنے لگی تھی۔ میری نظریں کالج میں ہر وقت اسی ایک چہرے کو ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ اور جس دن مجھے اس بات کا احساس ہوا تو میں بہت دیر تک دم بخود رہی تھی پھر میں نے اس سے نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں کالج میں اسے نظر انداز کرنے لگی۔ وہ اگر کہیں نظر آتا تو میں بہت خاموشی سے وہاں سے ادھر اُدھر ہو جاتی اگر کبھی تمہارے پاس آتے ہوئے نظر آتا تو میں کوئی بہانا کر کے تمہارے پاس سے چلی جاتی۔

تم تقریباً ہر ہفتے مجھے لے کر پروفیسر عثمان کے گھر جاتی تھیں۔ میں نے وہاں

جانا بھی چھوڑ دیا۔ میں خود کو یہ یقین دلانے میں مصروف تھی کہ مجھے اس سے محبت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔

اسی طرح پورا ایک ماہ گزر گیا۔ پھر اس دن میں کسی کام سے پروفیسر عثمان مکرم کے آفس میں گئی تھی۔ وہ آفس میں نہیں تھے مگر عاشر تھا۔ میں کنفیوز ہو گئی اور اس سے پہلے کہ میں خاموشی سے باہر آ جاتی' اس نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔

''درمکنون! کیا آپ کو میری کوئی بات بُری لگی ہے؟'' اس نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔

''نہیں۔ آپ نے یہ کیوں پوچھا ہے؟'' میں نے کچھ نروس ہو کر عاشر سے کہا تھا۔

''آپ پورے ایک ماہ سے مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مریم کے ساتھ ہمارے گھر پر نہیں آتیں۔ اگر کبھی میں مریم کے پاس آؤں تو آپ وہاں سے چلی جاتی ہیں اگر میں کہیں اور نظر آ جاؤں تو آپ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں۔''

''نیتوں کا حال تو صرف خدا جانتا ہے پھر وہ شخص ......'' میں گونگوں کی طرح کھڑی بس سوچ کر رہ گئی۔

''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں آج کل بہت مصروف ہوں۔'' میں نے اپنی زرد پڑتی رنگت بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہو سکتا ہے' ایسا ہی ہو۔ اسٹڈیز کی وجہ سے مصروف ہیں؟'' اس نے بڑے آرام سے میری بات مان لی۔

''ہاں۔'' میں نے سکون کا سانس لیا۔

''واقعی آپ کے پیپرز بھی تو جلد ہی ہونے والے ہیں۔ دو ماہ ہی تو رہ گئے ہیں۔ آپ کو بہت محنت کرنی پڑ رہی ہوگی۔'' ایک کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے اس نے مجھے دیکھے بغیر بڑی نرمی سے کہا۔ میرا دل چاہا۔ میں شرم سے ڈوب مروں۔ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میرا جھوٹ نبھانے میں میری مدد کر رہا تھا۔

دو ماہ تک اس سے دوبارہ میری ملاقات نہیں ہوئی اور جس دن میں اپنا آخری پیپر دے کر ہاسٹل آئی تو اس نے مجھے وہاں رنگ کیا تھا۔

''درمکنون! اگلے ہفتے میری بہن کی شادی ہے۔ مریم کو تو میرے پاپا انوائیٹ کریں گے ہی لیکن آپ کو میں انوائیٹ کر رہا ہوں۔''

فون پر اس کی آواز نے مجھے جتنا حیران کیا تھا۔ اس کے اس مطالبے نے اس سے زیادہ حیران کیا تھا پھر میں چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کرسکی۔ میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ میں عاشر کی دعوت پر وہاں جا رہی ہوں۔ تمہارے سامنے میں نے یہ ہی ظاہر کیا تھا کہ میں تمہارے کہنے پر وہاں جا رہی ہوں۔

اس نے اپنی بہن کی شادی کی تقریبات میں ہی مجھے پرپوز کیا اور میں انکار نہیں کرسکی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس رشتے کو کوئی قبول نہیں کرے گا۔ میں نے پھر بھی خود کو فریب دیئے رکھا اور اب ......اب میں خالی دل اور خالی ہاتھوں سے دعا گو ہوں کہ وہ مجھے بھول جائے۔ اسے زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے پھر مجھ جیسی لڑکی کے ساتھ اس نے عشق کا روگ کیسے پال لیا؟

کاش مریم! کاش مجھے کوئی جادو آتا ہوتا اور میں وہ جادو' وہ منتر اس پر پڑھ کر پھونک دیتی پھر اسے کبھی درمکنون نام کی کسی لڑکی کا خیال آتا نہ اس کی شبیہہ اس کے ذہن میں یوں نقش ہوتی۔

ہاسپٹل میں سارا دن میں ڈاکٹر عثمان مکرم سے چھپی پھرتی ہوں۔ عاشر کی طرح انہوں نے بھی کبھی کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی میری مجبوری جانتے ہیں۔ پھر بھی مجھے ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں وہ مجھ سے کچھ پوچھ نہ بیٹھیں۔ کہیں وہ اپنی ناراضگی کا اظہار نہ کریں۔

انہوں نے عاشر کا پرپوزل میرے لیے میرے گھر لے جانے سے پہلے تمہارے ذریعے دو بار مجھ سے پوچھا تھا۔ کہیں ہمارے خاندان میں صرف سیدوں میں تو رشتہ نہیں کیا جاتا اور میں مریم! سب کچھ جانتے ہوئے بھی انہیں صاف صاف سب کچھ نہیں بتا سکی تھی۔

میرے دل میں بس کہیں ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید ......شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔

شاید بابا کو مجھ پر ترس آجائے۔

شاید میری قسمت یاوری کر جائے۔

مگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ دوٹوک انکار ڈاکٹر عثمان مکرم کے منہ پر مار دیا گیا تھا۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ خاموشی سے پلٹ آئے تھے۔ میں نے بابا کو بہت سی دلیلیں دینے کی کوشش کی تھی۔ اور ہر دلیل میرے خلاف محاذ کو اور مضبوط کرتی گئی تھی۔ میرے سامنے کتابوں کا ڈھیر رکھ دیا گیا تھا۔ بابا کو لگا تھا' میں اپنا شجرہ نسب بھول گئی ہوں۔ میں اپنے عقیدے سے پھر گئی ہوں۔ میں نے ان کے اعتبار' ان کے اعتماد کو خاک میں ملا دیا تھا۔ میں نے ایسا کہاں کیا تھا۔ میں ایسا کیسے کرسکتی تھی۔ میں نے تو صرف وہ بنیادی حق استعمال کرنے کی کوشش کی تھی جو میرے دین نے مجھے دیا تھا۔ جو میرے پیغمبرؐ نے مجھے بخشا تھا اور اسی پیغمبرؐ کی آل نے اس حق کو مجھ سے چھین لیا تھا۔

مجھ پر دو پہرے دار لگا کر بابا سمجھتے ہیں مجھے ''غلط کام'' سے روک لیں گے۔ مگر میں تو کوئی غلط کام کرنا ہی نہیں چاہتی۔ اور اگر کرنا چاہوں تو کیا یہ دونگران روک سکتے ہیں۔ نہیں روک سکتے مگر یہ بات بابا کی سمجھ میں نہیں آتی۔ انہیں تو کبھی بھی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا پھر بھی وہ ایک لبرل آدمی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا بیٹی کو صرف تعلیم دلوا دینا لبرل ازم ہے۔ اور حقوق؟ ان کا کیا ہوگا؟ کیا حقوق دینا ناجائز ہے؟ میں حقوق پر کتنی ہی بحث کیوں نہ کرلوں۔ کتنی ہی جنگ کیوں نہ لڑوں' کچھ حقوق اہل سادات بیٹیوں کو دیتے ہی نہیں۔ کچھ چیزوں سے ہمیں محروم رہنا ہی پڑتا ہے۔ میں تمہیں کیا لکھتی ہوں۔ میں نہیں جانتی۔ بس میں لکھ دیتی ہوں۔ وہ سب جو میرے دل میں ہوتا ہے جو مجھے چبھتا ہے۔ جو اندر سے کاٹتا ہے۔ تمہیں بھی نہ لکھوں تو مر جاؤں اور ہے ہی کون جو میری باتیں سنے۔

درمکنون

23 مئی

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

پچھلے دنوں سے میری عجیب حالت ہوگئی ہے۔ ہر وقت ایک عجیب سی بے چینی میرے وجود کو گھیرے رہتی ہے۔ کسی چیز میں میرا دل نہیں لگ رہا۔ اب تو ٹرینکولائزرز کا

بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ میرا دل چاہتا ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور بھاگ جاؤں کسی جنگل' کسی ویرانے میں جہاں کوئی نہ ہو' کوئی بھی نہ ہو۔

مریم! مجھے فون کرو' مجھ سے بات کرو۔ میں تمہاری آواز سننا چاہتی ہوں۔ میں اپنے لیے کسی ایک آواز میں محبت اور نرمی محسوس کرنا چاہتی ہوں۔

خدا حافظ

درمکنون

24 جون

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تم رو رو کر میرے لیے پاگل ہو رہی ہو گی اور اس حالت میں اس طرح رونا اور پریشان ہونا تمہارے لیے کس قدر نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے تو میں اب تمہیں کبھی خط نہ لکھتی۔ میں جانتی ہوں۔ پچھلے چند ہفتوں میں تم نے کئی بار مجھے فون کیا ہے' مگر پھر بھی تمہاری مجھ سے گفتگو نہیں کروائی گئی۔ بہت اچھا ہوتا مریم! اگر تمہیں یہ پتا نہ چلتا کہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ اور میں ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوں۔ جس مشکل سے میں یہ کاغذ اور قلم ڈاکٹر سے حاصل کر سکی ہوں۔ وہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ اور اب میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔

مریم! میں ٹھیک ہوں۔ زندہ ہوں۔ تم پریشان مت ہونا۔ میرے لیے دعا کرنا۔

خدا حافظ

درمکنون

25 جولائی

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

پچھلے دو ماہ مجھ پر بہت بھاری گزرے ہیں۔ اب جب ایک بار پھر ہاسٹل کے

اس کمرے میں واپس آئی ہوں تو مجھے تم یاد آ رہی ہو۔ مریم! میرے وجود کے اندر اس قدر خاموشی ہے کہ مجھے یوں لگنے لگا ہے۔ جیسے میرے اندر کہر جم گیا ہو۔ وہی ہڈیوں تک اتر جانے والا۔ دسمبر کا سرد اور سفاک کہر اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آج کل جولائی ہے اور پھر بھی ...... آج آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر مجھے بے تحاشا ہنسی آئی۔ آئینے میں نظر آنے والا چہرہ درمکنون کا چہرہ تھا اور درمکنون ہی اسے پہچان نہیں پا رہی تھی۔

ہاسپٹل میں گزارے ہوئے دو ماہ نے مجھے بے حد بدصورت کر دیا ہے۔ اب تو شاید تم بھی مجھے پہلی نظر میں پہچان نہیں سکو گی۔ مگر مریم! میرا چہرہ بدلے یا وجود' قسمت کبھی نہیں بدلے گی۔ اس کو میرے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہے۔ پچھلے دو ماہ سے اپنے اردگرد وہی چہرے دیکھ دیکھ کر بے زار ہوگئی ہوں۔ تم سوچو گی میں کیسی بیٹی ہوں جو اپنے ماں باپ کے چہرے دیکھ کر بے زار ہو جاتی ہے۔ مگر مریم! میں کیا کروں۔ مجھے ان دونوں کے چہرے پر کوئی شفقت' کوئی مانوسیت نظر نہیں آتی۔ مجھے دوسرے لوگوں اور ان کے چہروں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

ان دونوں نے مجھ سے اتنی بڑی قربانی لی ہے کہ میری ذات پر کیے جانے والے ان کے سارے احسان اس ایک قربانی کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہو گئے ہیں۔

جب میں نے قیمت چکا دی تو پھر رشتے کس حد تک رہ گئے؟ ان کے مہنگے ڈاکٹرز' قیمتی میڈیسنز اور عمدہ خوراک میرے دل کے بیچوں بیچ لگائے گئے گھاؤ نہیں بھر سکتے۔ وہ مجھے خوش رکھنے کے لیے سب کچھ کر رہے ہیں تا کہ میں مکمل صحت یاب ہو جاؤں۔ ہاں بس عاشر عثمان مجھے نہیں دے سکتے۔ اور مجھے مریم! مجھے بس اسی ایک چیز کی ضرورت ہے۔ تم نے فون پر بار بار مجھ سے کہا تھا۔

"درمکنون! تمہیں نروس بریک ڈاؤن کیسے ہو گیا۔ تم اتنی کمزور تو نہیں تھیں۔"

ہاں مریم! میں پہلے کمزور نہیں تھی۔ اب ہو گئی ہوں۔ اپنے وجود اور ذات کی کرچیاں سنبھالنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ تم نہیں جانتیں اور میں ...... آج کل یہی کام کر رہی ہوں۔ میری بیماری نے مجھے دو ماہ تک ان دونوں باڈی گارڈز کے بھیانک چہروں سے دور رکھا۔ اب ہاسٹل میں آنے کے بعد ایک بار پھر وہی چہرے میرے وجود کو اپنی نظروں سے

چھلنی کرنے کے لیے میرے سامنے ہوں گے۔ میں جانتی ہوں۔ میں عاشر عثمان والی غلطی نہ کرتی تو بابا ان دونوں کو عذاب کی شکل میں میرے سر پر مسلط نہ کرتے۔

مگر اب تو عاشر عثمان میری زندگی میں نہیں ہے اب تو وہ اس شہر' اس ملک میں بھی نہیں ہے۔ پھر بھی بابا کو اتنی بے اعتباری کیوں ہے؟ مریم! مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ میں ان سے یہ کہہ سکوں کہ وہ مجھ پر اعتبار کریں۔ مجھ پر اس طرح پہرے مت بٹھائیں۔

میرا دل چاہتا ہے۔ میں شادی کرلوں۔ کسی بھی شخص سے مگر بس وہ سید نہ ہو۔ اس کے ساتھ میں عام زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ تمہارے جیسی زندگی سب لڑکیوں جیسی زندگی۔ مریم! میں کسی گدی کی جانشین بننا چاہتی ہوں نہ کسی مزار کی متولی۔ مجھ میں اتنی پاکیزگی ہے نہ روحانیت۔ میں نفس کو نہیں مار سکتی ہوں۔ میں لوگوں کو ان چیزوں کی دعائیں نہیں دے سکتی جو میرے پاس نہیں ہیں۔ عورتیں میرے ہاتھ چومیں' میری چادر کو آنکھوں سے لگائیں' میرے سامنے الٹے پیروں واپس جائیں۔ یہ سب میری خواہش نہیں ہے۔ مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔

مجھے گھر چاہیے۔ میں اپنی زندگی اجاڑ کر لوگوں کی زندگی نہیں سنوار سکتی اور یہ سب مریم! یہ سب میں بابا سے نہیں کہہ سکتی۔ وہ یہ سب سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ تو کچھ بھی سمجھ نہیں سکتے۔ میری ذات کا کوئی فیض میرے وجود کو نہ پہنچے اور میں ساری عمر لوگوں کو تعویذ دیتی رہوں۔ پھونکیں مارتی رہوں۔ کیوں مریم میں کیوں یہ سب کروں۔ کیا اللہ نے مجھے ہی زندگی اس لیے دی تھی کہ میں اس کو قربانی بنا کر رکھ دوں۔

بعض دفعہ میرا جی چاہتا ہے میں کہیں بھاگ جاؤں۔ بہت دور کہیں اتنی دور کہ کوئی میرے نام کے ساتھ کوئی القاب نہ لگائے۔ میں جو چاہے کروں۔ جیسے چاہوں رہوں۔ کوئی یہ نہ کہے کہ درمکنون سید زادی ہو کر یہ کر رہی ہے۔ مگر میں کہیں نہیں جا سکتی۔ میرے قدموں کی زنجیر یہی لفظ ہیں۔ نام ہے۔ خاندان ہے۔ مجھے ہر وقت اپنے وجود پر کیڑے رینگتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں زندہ نہیں ہوں۔ جیسے میں کوئی اور ہوں۔ درمکنون کوئی اور ہے۔

آج کل میری دماغی حالت کچھ ایسی ہے۔ اور میں زمین پر ایک بار پھر پیر جمانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

مریم! میرے لیے دعا کرو۔

خدا حافظ

درمکنون

26 اگست

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

مریم! میرے لیے عذاب ایک ایک کر کے بڑھتے ہی جا رہے ہیں اور ان کے کم ہونے کا کہیں کوئی امکان نہیں ہے۔ چند دن پہلے بابا میرے لیے ایک پرپوزل لے کر آئے تھے۔ اور بھلا کس کا؟ میرے خالہ زاد اور مجھ سے چار سال چھوٹے سبط علی کا۔ اور جانتی ہو' ستم ظریفی کیا ہے' درنجف اور سبط علی دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور یہ بات اگر مجھے معلوم ہے تو کیا بابا کو پتا نہیں ہوگی۔ امی نہیں جانتی ہوں گی۔

سبط علی نے بہت احتجاج کیا تھا۔ مگر پھر بھی اسے خاندان کی عزت کا واسطہ دے کر سب نے اپنی بات ماننے پر مجبور کیا ہے اور کسی نے درنجف کا نہیں سوچا۔ اس کا دل کتنا بانجھ ہو جائے گا۔ یہ خیال کسی کو کیوں نہیں آیا اور مریم! مجھے بتاؤ' میں کیسے اپنی بہن کے گلے میں پڑا ہوا ہار کھینچ کر اپنے گلے میں ڈال لوں۔ کیسے اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی روشنی کو بجھا کر اپنی آنکھوں کے دیے روشن کرنے کی کوشش کروں۔ میرے لیے کوئی ایثار کیوں کرے۔ کوئی قربانی کیوں کرے۔

میرے نروس بریک ڈاؤن نے بابا کو میرے بارے میں پریشان کر دیا ہے۔ اب وہ دوسروں کی چھتیں گرا کر میرے لیے محل تیار کرنا چاہتے ہیں۔

میں ان کی جانشین ہوں۔ ان کی گدی کی وارث جو ہوئی۔ پہلے میرا دل اجاڑ کر اب گھر آباد کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی دوسری بیٹی کا دل اجاڑ کر۔

مریم! ماں باپ اتنے خودغرض کیوں ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی عزت اور رواجوں کے سامنے اولاد کی آنکھوں کے پاتال نظر ہی نہیں آتے۔

"ہم نے تمہیں یہ دیا۔ ہم نے تمہیں وہ دیا۔"

اور پھر وہ ان سب نوازشات اور عنایات کی قیمت مانگتے ہیں اور قیمت اگر زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہو تو دل کس طرح خون ہوتا ہے۔ یہ تم نہیں جان سکتیں مریم! یہ صرف میں جان سکتی ہوں یا پھر درنجف۔ ایک معمولی سا عقیدہ' ایک معمولی سی انا اتنی بڑی چیزیں بن گئی ہیں کہ ان کے ہاتھوں بہت سی سیدہ درمکنون اور درنجف خوار ہو جاتی ہیں۔ کیا عاشر عثمان سے میری شادی سارے مسائل کا حل نہیں ہے؟ بتاؤ مریم! کیا ایک چھوٹی سی قربانی سب کچھ ٹھیک نہیں کر سکتی۔ بابا مجھے بے شک جائیداد سے عاق کر دیں۔ بے شک اپنا جانشین نہ بنائیں۔ بس اپنی مرضی سے میری شادی عاشر عثمان سے کر دیں۔ مجھے اپنی مرضی سے اپنے گھر سے رخصت کر دیں۔ پھر چاہیں ساری عمر اپنے پاس نہ آنے دیں اور بابا کو یہی کام سب سے مشکل لگتا ہے۔ یہ ہی کام پہاڑ لگتا ہے۔ مجھے خوشی دینا چاہتے ہیں مجھے گھر دینا چاہتے ہیں۔ عاشر عثمان کے بغیر کیا میرے لیے خوش رہنا اور کسی دوسرے شخص کا گھر آباد کرنا ممکن ہے۔ وہ بھی اس شخص کا گھر جسے میری بہن چاہتی ہے۔ جو درنجف کا عاشر عثمان ہے۔

مریم! سیدوں کے گھر بیٹیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ صرف بیٹے ہی ہونے چاہئیں۔ یہ لوگ بیٹیوں سے محبت کے دعوے کرتے ہیں انہیں سیپ میں بند موتی کی طرح رکھتے ہیں اور ساری عمر سیپ میں ہی بند رکھنا چاہتے ہیں۔ مریم! تم نے کبھی موتی کو گھن لگتے دیکھا ہے؟ میں نے دیکھا ہے ہاں مریم سیپ میں بند موتی کو بھی گھن لگ جاتا ہے۔ پھر وہ اندر ہی اندر برادہ بن جاتا ہے۔ کوئی شور کوئی آواز کیے بغیر۔

سیدہ درمکنون کو بھی سب نے مل کر سیپ کا موتی بنا دیا ہے۔ سیپ میں بند کر دیا ہے۔ اب گھن لگانا چاہتے ہیں۔ برادہ بنانا چاہتے ہیں اور سیدہ درمکنون انہیں روک نہیں سکتی۔ ہاتھ نہیں پکڑ سکتی۔ چیخ نہیں سکتی۔ بُرا بھلا نہیں کہہ سکتی۔ سر نہیں اٹھا سکتی۔

یہ سب کام اہل سادات کی بیٹیاں نہیں کر سکتیں۔ مجھے بتاؤ مریم! میں کیا کروں۔

میں کہاں جاؤں۔

لوگ کہتے ہیں سیدوں کی دعائیں ہمیشہ قبول کی جاتی ہیں۔ سیدوں پر آفتیں نہیں آتیں۔ مریم! اہل سادات پر اور آتا ہی کیا ہے۔ صبر کریں تو دل مر جاتا ہے۔ صبر نہ کریں تو ساری عمر ضمیر سنگسار کرتا ہے۔ ماں باپ کی بددعائیں دوزخ بن کر پیچھے بھاگتی رہتی ہیں۔ زمین پر دونوں پاؤں سے کھڑا رہنا ایک پاؤں کھڑے رہنے سے زیادہ مشکل ہے۔ ایک پاؤں پر کھڑا رہنے پر آپ تھک کر تو گر سکتے ہیں۔ دونوں پاؤں پر کھڑے رہنے سے یہ بھی نہیں ہو سکتا۔

میری دعا کسی کو نہیں لگتی۔ میں تمہارے لیے دعا نہیں کروں گی۔ تم میرے لیے دعا کرنا۔

خدا حافظ
درمکنون

27 ستمبر
لاہور
ڈیئر مریم!
السلام علیکم!

میری سالگرہ کا دن یاد رکھنے کے لیے تمہارا شکریہ۔ جانتی ہوں تم اس جملے پر ناراض ہو جاؤ گی پھر بھی۔ تمہارا کارڈ اور گفٹ ہمیشہ کی طرح پسند آیا۔ اس بار پہلی دفعہ تم نے مجھے اپنے ہاتھ سے یہ دونوں چیزیں نہیں دیں۔ بلکہ پارسل کی تھیں۔ اس سال میری زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں یہ بھی ایک تبدیلی تھی۔ اپنی سالگرہ والے دن تمہارا فون سن کر میں بہت دیر تک روتی رہی۔ بہت سے لوگ مجھ سے جتنے دور ہیں۔ میرے دل کے اتنے ہی پاس ہیں اور میری بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے اب ان لوگوں کے بغیر ہی' ان سے دور ہی رہنا ہے۔

مریم! سالگرہ والے دن تم سے پہلے اس نے بھی مجھے فون کیا تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچانتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ پھر میٹرن کو یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی کہ عاشر

عثمان کی کسی فون کال پر مجھے نہ بلایا جائے اور مریم! وہ رات تک کالز کرتا رہا تھا۔ میں نے اس سے بات کرنے سے اس کی آواز سننے سے خود کو باز رکھا۔ مگر میں اس کا کارڈ اور گفٹ وصول کرنے سے خود کو روک نہیں سکی۔

میں جانتی ہوں۔ مجھے یہ دونوں چیزیں نہیں لینی چاہیے تھیں۔ مگر مریم! میں کیا کروں۔ تم بتاؤ میں کیا کروں۔ مریم! میں اس کا ہر کارڈ' ہر خط لے لیتی ہوں۔ میں بزدل ہوں' میں منافق ہوں۔ میں ماں باپ کی نافرمان اولاد ہوں۔ میں باغی ہوں۔ میں سرکش ہوں۔

میں نے بابا سے وعدہ کیا تھا کہ میں عاشر کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھوں گی۔ اور میں ...... مریم! میں ان کو صریح دھوکا دے رہی ہوں۔ مگر میں کیا کروں۔ مجھے زندہ رہنا ہے۔ اس کے کارڈز اور خطوں کے بغیر میں مر جاؤں گی۔ میں اس کو ان خطوں کا جواب نہیں دیتی مگر وہ پھر بھی مجھے خط لکھتا رہتا ہے۔ کارڈ بھیجتا رہتا ہے۔ یاد دہانی کراتا رہتا ہے کہ وہ مجھ سے' صرف مجھ سے صرف درمکنون سے محبت کرتا ہے۔ صرف مجھے چاہتا ہے۔ صرف میری پروا کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ مریم! وہ مجھے یاد رکھے گا تو اپنی زندگی عذاب بنا لے گا۔ بھول جائے گا تو میری زندگی جہنم بن جائے گی۔ پھر بھی مریم پھر بھی میری خواہش ہے کہ وہ مجھے بھول جائے۔ درمکنون کے بغیر زندگی کو دیکھے۔

یہی بہتر ہے عاشر عثمان کے لیے۔ آہستہ آہستہ ہی سہی مگر اسے میرے بغیر رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تم ایک بار پھر اس سے بات کرو' اسے سمجھاؤ۔ اس سے کہو یہ میں چاہتی ہوں۔ یہ میری خواہش ہے۔

تم نے پوچھا ہے کہ میں تمہارے بیٹے یا بیٹی کے لیے نام تجویز کروں۔ تم میرا دیا ہوا نام اسے دینا چاہتی ہو۔ یہ تمہاری خواہش ہے۔ میں اسے کیسے رد کردوں۔ اگر تمہارے ہاں بیٹا ہوا تو اس کا نام بلال رکھنا اور اگر بیٹی ہوئی تو معصومہ مگر میری دعا ہے۔ تمہارے ہاں بیٹی نہ ہو۔ ہاں مریم! یہ جاننے کے باوجود کہ تم اپنی بیٹی کو بہت چاہو گی۔ بہت اختیار دو گی پھر بھی میں چاہوں گی کہ تمہارے ہاں بیٹی نہ ہو۔

خدا حافظ

درمکنون

28 اکتوبر

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

اس سال پہلی اور شاید آخری اچھی خبر مجھے تم نے دی ہے فون پر میں نے تمہیں بلال کی پیدائش پر مبارک باد دے دی ہے۔ اب تحریر کے ذریعے ایک بار پھر مبارک دے رہی ہوں۔ میری دعا ہے بلال تمہاری زندگی کو ہمیشہ خوشیوں سے منور کرتا رہے۔ تم نے اس کی پیدائش کے تین دن بعد اس کی جو فوٹو گرافس کھینچ کر مجھے بھیجی ہیں وہ مجھے مل گئی ہیں اور مریم میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔

وہ بالکل تمہارے جیسا ہے اور تمہیں لگتا ہے۔ اس کی شکل میرے جیسی ہے۔ میرا دل اس کی تصویر دیکھ کر چاہتا ہے کہ میں اس کے چہرے کے نقوش کو ہاتھ سے محسوس کروں۔ ماتھا' آنکھیں' ناک' ہونٹ' گال' تھوڑی ہر چیز اور اس کھکھلاہٹ کو سنوں جو تمہارے دل سے بلال کو دیکھ کر ابھرتی ہوگی۔ میرا دل چاہتا ہے مریم! کاش میں اس وقت تمہارے پاس تمہارے ساتھ مل کر بلال کو دیکھتی۔ تمہارے چہرے پر ابھرنے والی شفق دیکھ کر ایک بار پھر ہنسنے کی کوشش کرتی۔ ویسے ہی جس طرح ہم دونوں کبھی مل کر ہنسا کرتے تھے۔ مگر جانتی ہوں۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ میں بلال کے لیے کچھ گفٹس بھیج رہی ہوں۔ تم مجھے اس کی کچھ اور تصویریں بھجواؤ۔

خدا حافظ

درمکنون

29 نومبر

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

مریم! کل مجھے میرے نہ چاہنے کے باوجود سبط علی سے منسوب کر دیا گیا اور کل سے میں اپنے کمرے میں بند ہوں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں درنجف کا سامنا کر

سکوں۔ یا خود اپنا چہرہ ہی آئینے میں دیکھ سکوں۔ درنجف پچھلے چار دنوں سے گونگوں کی طرح میرے سامنے پھر رہی ہے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مجھ سے کہہ سکتی کہ میں سبط علی سے شادی نہ کروں۔ کیونکہ وہ سبط علی سے محبت کرتی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہی ویرانی دیکھی ہے جو کبھی عاشر عثمان کا رشتہ ٹھکرائے جانے پر میری آنکھوں میں در آئی تھی۔ میں نے اس کے وجود کو اسی طرح گم اور کھویا کھویا دیکھا ہے۔ جس طرح پچھلے ڈیڑھ سال سے میں بنی ہوئی ہوں۔ مگر پھر بھی وہ بولتی نہیں۔ کہتی نہیں کہ اس کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ اسے پتا ہے کہ سبط علی کے بعد خاندان میں اور کوئی دوسرا رشتہ نہیں ہے۔ اگر میری شادی اس سے ہو گئی تو پھر درنجف کو ساری زندگی پھوپھو آمنہ کی طرح اسی حویلی کی چار دیواری میں لمبی لمبی چادروں میں لپٹ کر گزارنی پڑے گی مگر مریم! وہ پھر بھی چپ ہے۔ میرے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی ہے۔ اس نے سوچا ہو گا کہ عاشر عثمان کا صدمہ بھلانے کا یہی واحد راستہ ہے۔ مگر مریم! سبط علی کبھی بھی عاشر عثمان کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اور دیکھو مریم! میں کس قدر بزدل ہوں۔ میں نے کچھ کہے بغیر سبط علی کے نام کی انگوٹھی اپنے ہاتھ میں پہن لی ہے۔ تقریباً دو ماہ بعد میں سبط علی اور درنجف کے خواب اجاڑ کر اپنا گھر بسانے چلی جاؤں گی۔ اور جب عاشر عثمان کو یہ سب پتا چلے گا تو کیا وہ مجھ پر تھوکے گا نہیں۔

اور کیا میں سبط علی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں؟

اس سوال کا جواب تم جانتی ہو۔ مگر مریم پھر بھی میرے والدین نے اپنی دونوں بیٹیوں کو ایک ہی چھری سے ذبح کرنے کا اہتمام کر لیا ہے۔ میں درنجف کا چہرہ پڑھ سکتی ہوں۔ کیا وہ نہیں پڑھ سکتے؟ بابا دوسروں کی بیٹیوں کے لیے اچھے نصیبوں کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اپنی بیٹیوں کا خیال کیوں نہیں آتا؟ بیٹی نہ سمجھتے مریدنی سمجھ کر ہی ہمارے حق میں دعا کرتے۔ پہلے درمکنون اجڑی تھی۔ اب درنجف کی باری ہے۔ پیچھے کون رہ جائے گا۔ کیا رہ جائے گا۔ سات نسلوں سے چلی آنے والی اس رسم کو کسی کو تو بدلنا چاہیے۔ کسی کو تو بنیاد کا پتھر بننا چاہیے۔ مگر میں' ہاں میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں بنیاد کا وہ پہلا پتھر نہیں بن سکتی۔ بنیاد کے اس پہلے پتھر کو بہت نیچے بہت گہرا دفن ہونا پڑتا ہے۔ بہت وزن سہارنا پڑتا ہے اسے۔ اور میں مریم! میں اندر سے اتنی کھوکھلی' اتنی بھربھری ہو چکی ہوں کہ کبھی

بھی وہ پہلا پتھر نہیں بن سکتی۔ اس شخص سے شادی کرنا کیسا لگتا ہے جس کے دل میں کوئی پہلے سے ہی آباد ہو چکا ہو اور کیسا لگتا ہے مریم! یہ علم کہ وہ دل آباد کرنے والا آپ کو بھی بہت عزیز ہو۔

دو ماہ بعد میری زندگی میں ایک ایسا ہی بٹا ہوا شخص آئے گا۔ جس کے دل میں میری ہی طرح کوئی پہلے سے ہی آباد ہو گا۔ اسے درنجف یاد آئے گی۔ مجھے عاشر عثمان۔ میرے وجود میں اسے نجف کی جھلک نظر آئے گی اور اس کے وجود میں...... میں عاشر عثمان کی شبیہہ ڈھونڈوں گی۔ اور یہ تلاش ہمیشہ جاری رہے گی۔ ہم دونوں کو ساری عمر اپنے اپنے آسیبوں کے ساتھ رہنا ہے۔ ہاں مریم! جس سے محبت کی جائے' وہ اگر نہ ملے تو پھر وہ آسیب ہی بن جاتا ہے۔ لرزاتا ہے۔ ہولاتا ہے۔ تڑپاتا ہے۔ رلاتا ہے۔ ہاں مگر مارتا نہیں۔ مریم! بس مرنے نہیں دیتا۔ موت جیسی نعمت حاصل ہونے نہیں دیتا۔ مریم! میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں اپنی ساری ڈگریاں ایک ایک کر کے ایک بہت بڑے الاؤ میں جلاؤں۔ انہیں بہت اونچا اچھالوں اور پھر جب وہ زور سے بھڑکتے ہوئے الاؤ میں گریں اور شعلے یک دم تیز ہو جائیں تو میں زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ ہنسوں' چیخیں مار مار کر ہنسوں۔ میرا کوئی سرٹیفکیٹ' کوئی ڈگری۔ میری ذات کو ریت کا ایک ڈھیر بننے سے نہیں روک سکتا۔ کوئی گولڈ میڈل مجھے عاشر عثمان نہیں دلا سکتا۔ کوئی رول آف آنر سبط علی سے میری شادی نہیں رکوا سکتا۔ اور پھر بھی مریم! پھر بھی میں اس دنیا میں رہنا چاہتی ہوں۔ ہے نا حیرت کی بات کہ مجھے ابھی بھی زندگی سے نفرت نہیں ہوئی۔ ابھی بھی یہاں میرا دم نہیں گھٹا۔ مگر کب تک مریم! کب تک میں اس طرح سانس لیتی رہوں گی۔ دوسروں کے گلے گھونٹ کر میں کب تک زندہ رہوں گی۔ پہلے عاشر عثمان تھا۔ صرف عاشر عثمان۔ اب درنجف اور سبط علی۔ میری گردن پر کتنوں کا خون آئے گا۔ میری بزدلی کتنوں کی زندگیاں اجاڑے گی۔ کتنوں کی آنکھوں کے خواب چھینے گی۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں۔ اپنی مرضی سے نہیں کر رہی۔ مگر پھر بھی پشیمان ہوں اور وہ جو یہ سب کچھ کر رہے ہیں' بقائمی ہوش و حواس کر رہے ہیں۔ مریم! ان کا دل کیوں نہیں کانپتا؟ انہیں خوف کیوں نہیں آتا۔

مریم! میرے لیے کچھ ایسا کرو کہ مجھے سکون آ جائے۔ یہ کانٹے جو میرے وجود

پر اگ آئے ہیں' یہ ختم ہو جائیں۔

درِمکنون

30 دسمبر

لاہور

ڈیئر مریم!

السلام علیکم!

خدا سے دعا ہے۔ وہ تمہیں ہر تکلیف سے بچائے۔ تمہیں ہر وہ چیز دے جس کی تمہیں کبھی خواہش ہو۔

تمہارا خط مجھے دو دن پہلے ملا ہے حسب معمول تم نے مجھے بہت سے مشورے' بہت سی نصیحتیں کی ہیں۔ مریم! اب مجھے کسی مشورے کسی نصیحت کی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے دلدل سے باہر نکلنے کا طریقہ آ گیا ہے۔ مجھے بھول بھلیوں سے باہر نکلنے کا راستہ نظر آ گیا ہے۔ لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں تمہیں اس راستے کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ میں اپنی ذات کے بارے میں بنائے گئے تمہارے تاج محل کو تاش کے پتوں کی طرح گرنے نہیں دینا چاہتی۔

آج میں اپنی الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھ رہی تھی۔ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو میں نے خرید کر لانے کے باوجود نہیں پڑھیں۔ اور بہت سی ایسی ہیں جو آدھی پڑھ کر رکھ دیں۔ مجھے خیال آیا تھا کہ ہم کتابیں کیوں پڑھتے ہیں؟ اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے ہے نا اور یہ علم کیا دیتا ہے آگہی اور یہی آگہی پورے وجود کو اندر سے لہولہان کرتی رہتی ہے۔ جتنا علم ہمیں زندگی دیتی ہے۔ کیا وہ کافی نہیں ہے۔ ہم کیوں کتابیں خرید خرید کر آگہی کے اس عذاب میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ کتابیں چیزوں تک پہنچنے کا رستہ دکھاتی ہیں۔ منزل تک نہیں پہنچاتیں۔ یاد ہے ناں تم مجھے تحفے کے طور پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب ہی دیتی تھیں۔ آج میں نے وہ ساری کتابیں نکال کر دیکھی ہیں' وہ ساری باتیں پڑھی ہیں جو تم نے ان پر میرے لیے لکھی تھیں۔

مریم! تم جانتی ہو میں نے عاشر عثمان کے علاوہ کسی سے محبت نہیں کی۔ میں تو کسی

دوسرے سے محبت کے قابل ہی نہیں رہی۔ لوگ جس سے محبت کرتے ہیں۔ اس پر اپنی جان تک نچھاور کر دیتے ہیں۔ میں نے جس سے محبت کی ہے' اسے سولی پر لٹکا دیا ہے۔ نہ وہ زندہ رہے نہ وہ مرے۔ سب سے زیادہ تکلیف' ناامیدی نہیں دیتی بلکہ امید اور ناامیدی کے درمیان والی حالت دیتی ہے اور میں نے پچھلے ڈیڑھ سال سے عاشر عثمان کو اسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔

پھر سبط علی ہے۔ سید سبط علی گیلانی جس سے مجھے محبت ہے نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ جسے مجھ سے محبت ہے نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ مگر پھر بھی...... پھر بھی اگلے ماہ آج سے پورے چھبیس دن بعد اس سے میری شادی طے کر دی گئی ہے۔

شادی کر لوں تو درِنجف اجڑ جائے گی۔ سبط علی برباد ہو جائے گا۔ عاشر عثمان کا ہمیشہ کے لیے عورت کے وجود سے اعتبار اٹھ جائے گا اور خود میں سیدہ درِمکنون ساری عمر آوازوں اور چہروں کے جنگل میں سر پٹختی پھروں گی۔

اور اگر میں سبط علی سے شادی نہ کروں تو عاشر عثمان اپنی ساری زندگی امید اور ناامیدی کی اسی صلیب پر لٹکتے ہوئے گزار دے گا۔ اور میں ساری عمر اسی حویلی کے ویران دالانوں اور برآمدوں میں کسی بدروح کی طرح چکراتی پھروں گی۔ مجھے بڑھاپے سے خوف نہیں آتا مریم! مگر تنہائی سے آتا ہے۔ سناٹا اور ویرانہ میرے وجود کو مٹی کا ایک بھربھرا ڈھیلا بنا دیں گے۔

میں اپنی پھوپھو کی طرح لمبے سفید چوغے والی بدروح بننا نہیں چاہتی۔ جو سارا دن کسی رئیس کی طرح لوگوں کو تسلیاں اور دلاسے بانٹتی ہے۔ اور رات کو کسی فقیر کی طرح آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ان ہی دونوں چیزوں کی بھیک مانگتی ہے۔ مگر ہر بار آئینہ اسے ایک نیا سفید بال اور چہرے پر پڑی ہوئی ایک نئی جھری کچھ اور سناٹے کے ساتھ بخش جاتا ہے۔ پھر وہ دوپٹے سے بے نیاز کسی پاگل کی طرح کمرے کے چکر کاٹ کاٹ کر وظیفے پڑھتی جاتی ہے۔

شاید وہ وظیفے انہیں سکون بخشتے ہوں گے۔ انہیں کوئی امید دلاتے ہوں گے مگر مجھے کوئی وظیفہ سکون دے سکتا ہے نہ امید۔ ان کی زندگی میں کبھی کوئی عاشر عثمان نہیں رہا اور

میری زندگی میں عاشر عثمان ہی تو ہے۔

مریم! تم نے لکھا ہے کہ اگر میں عاشر عثمان کے بغیر نہیں رہ سکتی تو پھر اس سے شادی کرلوں۔ ماں باپ کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر' ان کی رضامندی حاصل کیے بغیر۔

مریم! میں یہ بھی نہیں کرسکتی۔ آئندہ آنے والی نسلوں تک میرے ماں باپ اور میں خاندان کی لعنت و ملامت کا شکار رہیں گے۔ مجھے ماں باپ کی بددعاؤں سے بڑا خوف آتا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں اپنے باپ کے کندھے پر رکھی چادر کو چھین کر دور پھینک دوں۔

اس خاندان میں دوبارہ کبھی کسی لڑکی کو سکول کی شکل دیکھنے نہیں دی جائے گی۔ میں برداشت نہیں کرسکتی۔ کوئی میرے بابا کو بیٹی کا طعنہ دے۔ کوئی یہ کہے کہ ”دیکھ لیا تعلیم کے لیے گھر سے باہر نکالنے کا نتیجہ اب بھگتو۔“

میں ہنس رہی ہوں مریم! میں بہت ہنس رہی ہوں۔ کل تک میں سوچ رہی تھی کہ میں کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ ساری عمر کے لیے کنوارا رہنا' عاشر کے ساتھ پسند کی شادی یا سبط علی کے ساتھ شادی کے علاوہ میرے پاس کوئی چوتھا رستہ ہے ہی نہیں۔ مگر چوتھا رستہ بھی تھا اور ہے بعض دفعہ ہمیں بہت سامنے کی چیزیں نظر نہیں آتیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اگر چوتھا رستہ پہلے نظر آجاتا۔ تو یہ پچھلے ڈیڑھ سال کی اذیت کا سامنا نہ کرنا پڑتا نہ تمہیں ہر ماہ میرا خط پڑھ کر اس طرح آنسو بہانے پڑتے جس طرح تم نے پچھلے ماہ فون پر بہائے تھے۔

مریم! میں نے تم سے بہت محبت کی ہے مریم! میں نے تو کبھی بھی کسی سے نفرت نہیں کی۔ حتیٰ کہ بابا سے بھی نہیں۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں عاشر عثمان کے علاوہ کسی اور کے دل میں میرے لیے رحم کیوں نہیں ہے۔ بابا کو تو سوچنا چاہیے تھا۔ صرف تعلیم کی آزادی تو آزادی نہیں ہے۔ یہ تو پیاسے کو سراب دکھانے کے مترادف ہے۔ تعلیم دیتے ہیں۔ حق نہیں دیتے۔ پانی دکھاتے ہیں پلاتے نہیں۔ اہل سادات بیٹیوں کو عزت دیتے ہیں۔ محبت دیتے ہیں۔ مگر گھر بسانے نہیں دیتے۔ جس پیغمبر کی ہم آل ہونے کے دعوے دار ہیں انہوں نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ انہوںؐ نے تو عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں رکھا تھا۔ پھر آل رسولؐ نے یہ چھوت چھات اپنی بیٹیوں کا مقدر کیوں بنا دی۔ میں سیدہ درمکنون علی عباس رضوی ہوں تو

اس میں میرا کیا کمال ہے۔ وہ صرف عاشر عثمان ہے۔ تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ اسے اسی خدا نے بنایا ہے۔ جس نے محمدؐ کو رسول بنایا۔

بائیس سال تک میں بھی نام ونسب اور مرتبہ کے اسی فخر میں مبتلا رہی پھر ہاں پھر میری زندگی میں عاشر عثمان آگیا۔ اور وہ فخر ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گیا۔ پتا ہے مریم! آج مجھے اپنا وجود کیکٹس کا پودا لگ رہا ہے۔ جس نے دوسروں کو تکلیف پہنچانے کے لیے' ان کے ہاتھ زخمی کرنے کے لیے کیسے کیسے کانٹے اگائے ہوتے ہیں۔ ہم نے بھی تو ایسے ہی کانٹے اپنے وجود پر اگا رکھے ہیں۔ کوئی نام ونسب کا کانٹا۔ کوئی مال وجاہ کا کانٹا۔ کوئی حسن وخوبصورتی کا کانٹا اور ہر کانٹا ہاتھ کو نہیں روح کو چھید کر رکھ دیتا ہے۔

مریم! میری ہر غلطی کو معاف کر دینا۔ تم تو ہمیشہ ہی معاف کر دیتی ہو اور مجھے ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ میں خدا سے ایک بار پھر دعا گو ہوں کہ وہ تمہیں بہت سی خوشیاں دے۔ تمہیں ہمیشہ بہت پُرسکون رکھے۔ میری طرف سے بلال کو ڈھیروں پیار کرنا۔

خدا حافظ

تمہاری دوست

سیدہ درمکنون علی عباس رضوی

31 دسمبر

لاہور (نمائندہ خصوصی) کل ایک مقامی سرکاری ہاسپٹل میں ہاؤس جاب کرنے والی ایک لیڈی ڈاکٹر پراسرار حالت میں مردہ پائی گئی۔ متوفیہ کا نام سیدہ درمکنون علی عباس رضوی بتایا جاتا ہے۔ ہمارے نمائندہ کی اطلاع کے مطابق متوفیہ جنوبی پنجاب کے ایک بہت معزز مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تفصیلات کے مطابق متوفیہ 29 دسمبر کی رات کو نائٹ شفٹ کے بعد حسب معمول واپس ہاسٹل آئی اور صبح نو بجے کے قریب چوکیدار کو ایک خط پوسٹ کرنے کے لیے دے کر میٹرن کو یہ کہہ کر واپس کمرے میں چلی گئی کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔ اور وہ آرام کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ لیکن جب شام دیر تک وہ دوبارہ اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی تو میٹرن نے بار بار دروازہ بجایا

اور دروازہ نہ کھولنے پر جب چوکیدار اور کچھ دوسرے ملازموں کے ذریعے دروازہ توڑا تو اندر متوفیہ کی لاش پڑی تھی۔ گھر والوں کو اطلاع دی گئی تو وہ زبردستی لاش لے گئے اور پوسٹ مارٹم نہیں کرنے دیا۔

متوفیہ کے سامان اور کمرے کی تلاشی لینے پر پولیس کو کچھ ڈائریز اور ایسے ثبوت ملے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متوفیہ اپنی مرضی سے کہیں شادی کرنا چاہتی تھی اور اس معاملے پر والدین سے اس کے تعلقات کشیدہ چلے آ رہے تھے۔

پولیس نے اس سلسلے میں جب متوفیہ کے خاندان سے رابطہ کیا تو انہوں نے کچھ بتانے سے انکار کردیا۔

متوفیہ کے کمرے کی ایک کھڑکی کے شیشے پر یہ عبارت تحریر تھی۔ ”زندگی گندی ہے“ پولیس نے خودکشی کا مقدمہ درج کر کے تحقیقات شروع کر دی ہیں۔

☆......☆

”بس یار! یہ پڑھی لکھی لڑکیوں کے بڑے چکر ہوتے ہیں بندہ پوچھے تمہیں ماں باپ نے پڑھنے بھیجا ہے پڑھو۔ پڑھائی چھوڑ کر آوارہ قسم کے لڑکوں کے ساتھ چکر شروع کر دیتی ہیں۔ پھر ماں باپ انہیں کے فائدے اور بھلے کی خاطر آوارہ قسم کے لڑکوں سے شادی کرنے نہیں دیتے اور یہ اس طرح خاندان کا نام بدنام کرتی پھرتی ہیں۔ اب ذرا سوچو کتنا روپیہ لگایا حکومت نے اس لڑکی کو ڈاکٹر بنانے پر اور اس نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ اسے دوسروں کے علاج سے زیادہ اپنی شادی کی پڑ گئی تھی۔“

لائبریری میں لڑکیاں بلند آواز سے اسی ایک خبر پر تبصرے کر رہی تھیں اور سیدہ حنا مغیث ہاشمی زرد چہرے کے ساتھ اخبار ہاتھ میں لیے یک ٹک ایک لائن کو دیکھتی جا رہی تھی۔

”زندگی گندی ہے۔“

لائبریری میں آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کے دماغ میں سناٹا پھیلتا جا رہا تھا۔

بس اک داغِ ندامت

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوگئی۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ پہلے وہ جب گھر آتی تھی تو اس کے بھتیجے بھتیجیوں کا ہنگامہ باہر تک آ رہا ہوتا تھا۔ لان عبور کر کے وہ اندرونی دروازے تک پہنچ گئی اور پھر اس میں اتنی ہمت اور حوصلہ باقی نہیں رہا کہ وہ بیل بجاتی اور گھر والوں کو اپنی آمد کی اطلاع دیتی' کوئی بھی لڑکی اس کی جگہ ہوتی تو اتنی ہی بے حوصلہ ہوتی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی۔ آنسو اس کے گالوں کو بھگوتے ہوئے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔ اور وہ جیسے ان سے بالکل بے خبر تھی۔ پھر عذرا بھابھی نے اچانک اسے اندر والی کھڑکی سے دیکھ لیا تھا۔ غم و غصہ میں ڈوبی ہوئی وہ کچن میں گئی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ میمونہ بھابھی نے انہیں اس سراسیمگی کے عالم میں آتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

”مومل واپس آ گئی ہے۔“

”کیا؟“ میمونہ بھابھی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

”وہاں برآمدے میں بیٹھی ہے۔ میں نے اسے کھڑکی سے دیکھا تھا۔ تم یہ بتاؤ فاروق کیا کر رہا ہے؟“

”وہ تو سو رہے ہیں۔“

”بس ٹھیک ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“ عذرا بھابھی میمونہ کو ساتھ لے کر باہر آ گئیں۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور بے ساختہ اٹھ کر کھڑی ہو

گئی۔اس کی آنکھوں سے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔

"کیا لینے آئی ہو یہاں؟" عذرا بھابھی کا سوال اس کی سماعت سے بم کی طرح ٹکرایا تھا۔

"بھابھی!" وہ صرف یہی کہہ سکی۔

"یہاں سے چلی جاؤ جہاں تین دن گزارے ہیں وہاں باقی زندگی بھی گزار سکتی ہو۔" عذرا بھابھی نے دبی آواز لیکن تلخ لہجے میں اس سے کہا۔

"بھابھی! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے تو اغوا کرلیا گیا تھا۔آپ......"

عذرا بھابھی نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔"یہ ڈرامہ کسی اور کے سامنے کرنا۔ ہمارے لیے تم اور تمہارے لیے ہم مر گئے ہیں۔تم اپنے بھائیوں کو اچھی طرح جانتی ہو اگر انہیں تمہارے آنے کا پتا چل گیا تو وہ تمہیں جان سے مار دیں گے۔ اس لیے بہتر ہے تم اپنی جان بچاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" عذرا بھابھی نے بہت زہریلے لہجے میں کہا تھا۔

"بھابھی پلیز' مجھ پر رحم کریں۔ میری کوئی غلطی نہیں۔ میں کہاں جاؤں گی۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔عذرا بھابھی پر اس کے آنسوؤں کا الٹا اثر ہوا۔

"یہ اس وقت سوچنا تھا جب گھر سے بھاگی تھی۔تمہیں اپنے بھائیوں کو تماشا بناتے ہوئے شرم نہیں آئی۔تم نے یہ نہیں سوچا کہ لوگ ان سے کیسے کیسے سوال کریں گے۔تم نے ہم پر رحم نہیں کیا ہم تم پر رحم کیوں کریں۔ہم نے بھی اپنی بیٹیاں بیاہنی ہیں اور تمہیں گھر میں رکھ کر ہم ان کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتے۔ہمیں معاف کرو اور یہاں سے چلی جاؤ۔ ہم پر رحم کرو۔ تمہارے بھائی تمہیں قتل کر دیں گے اور خود پھانسی چڑھ جائیں گے۔تم کیوں ہمارا گھر برباد کرنا چاہتی ہو۔ یہاں سے جاؤ۔"

بھابھی بات کرتے کرتے اسے بازو سے پکڑے ہوئے گیٹ تک لے آئیں اور پھر گیٹ کھول کر ایک جھٹکے سے اسے باہر دھکیل دیا۔ گیٹ بند کرتے وقت انہوں نے کہا۔

"دوبارہ یہاں مت آنا۔" وہ سکتے کے عالم میں بند گیٹ کو دیکھتی رہی۔ یہ سب کچھ اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اسے گھر والوں کی نفرت اور غصے کا

سامنا کرنا پڑے گا مگر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اسے گھر سے نکال دیں گے۔شاید اس لیے کیونکہ وہ اپنے آپ کو بے قصور سمجھ رہی تھی۔لیکن اسے بے قصور نہیں سمجھا گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی' وہ اب کہاں جائے گی پھر اس نے باری باری اپنے سارے رشتہ داروں اور دوستوں کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کیے اور جیسے کوئی پینڈورا باکس کھل گیا تھا۔

ایک ہی دن میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا جو چیزیں گزرے ہوئے بیس سال اسے نہیں سکھا سکے تھے۔ وہ اس ایک دن نے اسے سکھا دی تھیں۔ وہ رشتہ داروں کے رویے سے دلبرداشتہ نہیں ہوئی اگر سگی بھابھیاں اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکی تھیں تو کوئی چچا یا پھوپھی کیسے رکھ لیتے لیکن دوستوں کے رویئے نے اسے حقیقتاً رلایا تھا۔شاید اس کے بھائی اس کی تلاش میں اس کی سب دوستوں کے گھر جا چکے تھے۔ اس لیے وہ جہاں گئی وہاں پہلے سے ہی اس کے بارے میں بہت سی داستانیں موجود تھیں۔ باری باری وہ اپنی چاروں دوستوں کے گھر گئی۔ فاریہ کی امی نے دروازے پر ہی اس سے کہہ دیا کہ فاریہ گھر پر نہیں ہے اور پھر دروازہ بند کرلیا۔

سائرہ کی امی نے بڑی درشتی سے اس سے پوچھا۔

"سائرہ سے کیا کام ہے؟" وہ کہنے کی ہمت نہیں کر پائی اور وہاں سے پلٹ آئی۔ باقی دونوں دوستوں کے گھر بھی اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوا تھا۔ وہ دوست جو تین دن پہلے تک اسے کھینچ کھینچ کر اپنے گھر لے جاتی تھیں۔ اب اسے پانی تک پلانے پر تیار نہیں تھیں۔ مومل میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان سے مدد مانگتی' اس نے ان کی شہہ پر اپنی زندگی برباد کر لی تھی اور وہ اسے پہچاننے کو تیار نہیں تھیں۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ ایک سڑک کے کنارے لگے ہوئے سرکاری نلکے سے اس نے پانی پیا اور دوبارہ بے مقصد سڑکوں پر چلنے لگی۔ اس کی دوست اس کا واحد سہارا اور آخری امید تھیں اب اور کوئی نہیں تھا جس کے پاس وہ مدد کے لیے جا سکتی۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں سڑک پر چل رہی تھی جب اس نے اچانک کسی کے منہ سے اپنا نام سنا تھا۔

"مومل! مومل۔" اسے اپنا نام بے حد اجنبی لگا تھا۔ پھر اچانک کسی نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"کہاں گم ہوتم؟ آواز ہی نہیں سنتیں۔ میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہی ہوں۔"

اس بار اس نے آواز اور چہرہ پہچان لیا' وہ فاطمہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی جو بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مومل سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ فاطمہ اس کا چہرہ دیکھتے ہی کچھ چونک گئی تھی۔

"کیا ہوا مومل! تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے تشویش سے اس کی سوجی ہوئی آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا تھا۔

"کیا ہوا ہے مومل! تم اس طرح مجھے کیوں دیکھ رہی ہو؟" اس بار فاطمہ نے ہلکے سے اس کا کندھا جھنجھوڑا تھا۔ مومل کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔

"انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔" وہ یہ کہہ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

فاطمہ اور اس کی ساتھی لڑکی اسے روتے دیکھ کر گھبرا گئیں۔ وہ مین روڈ پر کھڑی تھیں اور لوگ آتے جاتے ہوئے انہیں گھور رہے تھے۔

"فاطمہ! میں گاڑی لاتی ہوں۔ ہم مومل کو ہاسٹل لے جاتے ہیں پھر وہیں سب کچھ پوچھنا۔"

ربیعہ یہ کہہ کر تیزی سے کار پارکنگ کی طرف گاڑی نکالنے چلی گئی۔ فاطمہ اسے چپ کروانے میں لگ گئی لیکن وہ چپ ہونے کے بجائے اور زیادہ رونے لگی تھی۔ اس کے اس طرح رونے پر فاطمہ کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ چند منٹوں بعد ربیعہ کار لے آئی اور فاطمہ اسے کار میں بٹھا کر ہاسٹل لے آئی تھی۔ ہاسٹل کے کمرے میں پہنچنے کے بعد بھی وہ اسی طرح ہچکیوں اور سسکیوں سے روتی رہی مگر اس بار فاطمہ نے اسے چپ کروانے کی کوشش نہیں کی۔ ربیعہ اور فاطمہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر ربیعہ نے دراز سے ایک ٹیبلٹ نکال کر پانی کے گلاس کے ساتھ فاطمہ کو تھما دی۔

"اسے یہ ٹیبلٹ کھلا دو اگر یہ اسی طرح روتی رہی تو مجھے ڈر ہے کہیں اس کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔ تم اسے چپ کرواؤ۔ میں تمہارے لیے چائے اور

اسنیکس بھجواتی ہوں۔"

ربیعہ ہلکی آواز میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ فاطمہ نے بڑی نرمی سے ایک بازو اس کے کندھے کے گرد حمائل کر لیا اور پیار سے اسے تھپکنے لگی۔

"میری طرف دیکھو مومی! دیکھو چپ ہو جاؤ۔ مجھے بتاؤ۔ تمہیں کیا پریشانی ہے۔ پرسوں تمہاری بھابھی نے ہاسٹل فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ تم یونیورسٹی سے گھر نہیں پہنچیں اور تمہاری یونیورسٹی کی فرینڈز نے بتایا ہے کہ تم اس دن یونیورسٹی گئی ہی نہیں۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ کہیں تم میرے پاس تو نہیں آئیں۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ تم یہاں نہیں آئیں اور دو دن میں انہیں فون کر کے پوچھتی رہی کہ تمہارا کچھ پتا چلا کل میں تمہارے گھر بھی گئی مگر تمہارے گھر والوں کو تمہارا کچھ پتا نہیں تھا۔ اور آج تم مجھے سڑک پر مل گئی ہو اور تم کہہ رہی ہو کہ انہوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا۔ آخر معاملہ کیا ہے۔ تم اتنے دن کہاں غائب رہی تھیں؟" فاطمہ اس سے پوچھ رہی تھی اور وہ آنسو بہاتی رہی۔

"مومل! اپنی پریشانی مجھے بتاؤ۔ ہوسکتا ہے' میں تمہاری مدد کرسکوں۔" وہ بڑے نرم لہجے میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

"فاطمہ! اگر میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا تو کیا تم مجھے یہاں سے نکال دو گی؟"

اس نے روتے روتے فاطمہ سے پوچھا تھا۔ فاطمہ نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "نہیں مومل! میں بھلا ایسا کیوں کروں گی۔ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی' چاہے تم سے کوئی غلطی کیوں نہ ہوئی ہو۔"

فاطمہ نے جیسے اس کی ڈھارس بندھائی تھی۔ وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ ہونٹ بھینچے ہوئے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

فاطمہ سے اس کی دوستی بڑے عجیب انداز میں ہوئی تھی۔ فاطمہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی۔ پہلی دفعہ ان کی ملاقات مومل کے کالج میں ہوئی تھی جہاں انہوں نے بلڈ کیمپ لگایا تھا۔ مومل اپنا بلڈ گروپ چیک کروانے گئی تھی مگر وہاں فاطمہ کے اصرار پر اس

نے اپنا بلڈ ڈونیٹ کیا۔ دونوں کے درمیان دوستی کا آغاز ہو گیا تھا۔ فاطمہ کی ساری فیملی سعودی عرب میں تھی اور وہ اکیلی پاکستان میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ پھر دونوں اکثر ملنے لگیں۔ مول ہر ویک اینڈ پر فاطمہ کو اپنے گھر بلا لیتی اور اکثر خود بھی اس کے ہاسٹل جایا کرتی۔ جلد ہی دونوں کی دوستی اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ باہر سے آنے والی چیزوں میں سے آدھی چیزیں فاطمہ اسے تھما دیا کرتی تھی۔ مول کے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کے بعد ملاقاتوں میں کچھ کمی آ گئی تھی مگر فاطمہ کے التفات میں نہیں، وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح اسے فون کیا کرتی تھی لیکن اب وہ پہلے کی طرح ہر ویک اینڈ پر اس کے گھر نہیں آتی تھی کیونکہ وہ میڈیکل کے فائنل ایر میں تھی اور اتنا فالتو ٹائم اس کے پاس نہیں ہوتا تھا۔

مول کو پہلے فاطمہ کے پاس جانے کا خیال نہیں آیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ بھی دوسری دوستوں کی طرح اسے دھتکار دے گی۔ مگر اب اسے فاطمہ کے پاس ہی پناہ ملی تھی۔

مول دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ وہ اس وقت دس سال کی تھی جب اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا اور اسے دونوں بڑے بھائیوں نے پالا تھا۔ انہوں نے اسے بالکل پھولوں کی طرح رکھا تھا۔ بھابیوں کو نند سے شوہروں کا یہ التفات کھٹکتا تھا لیکن وہ زہر کے گھونٹ پینے پر مجبور تھیں۔ شوہروں کو خوش کرنے کے لیے وہ ظاہری طور پر اس پر صدقے واری جاتی تھیں۔ کیونکہ اس کے طفیل ان کی بہت سی فرمائشیں ان کے شوہر پوری کر دیتے تھے۔ مول اگر سمجھ دار ہوتی تو بھابیوں کے بناوٹی رویئے کو سمجھ جاتی لیکن اس میں اگر یہ خوبی ہوتی تو شاید وہ اس حال تک کبھی نہ پہنچتی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے اشاروں پر چلا کرتی تھی۔ کسی نے اس کی تھوڑی سی تعریف کی اور کسی کام پر اکسایا اور اس نے بلا سوچے سمجھے وہ کام کر دیا۔ اس بات کا اندازہ لگائے بغیر کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا اور اس پر کیا اثر ہو گا۔ وہ ہمیشہ وہی کرتی تھی جو اس کی دوستیں کہا کرتی تھیں۔

بعض دفعہ اسے اس بات کا فائدہ ہوتا مگر زیادہ تر اسے نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی دوستوں کو سائنس سبجیکٹس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس نے شاندار نمبروں کے باوجود سائنس پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کی دوستوں کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی، وہ کسی کو

بتائے بغیر وہ چیز اپنی فرینڈز کو پہنچا دیتی۔ اس کی دوستوں نے ہمیشہ اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائی۔ سائرہ کو سکول سے باہر کوئی لڑکا تنگ کرتا تھا۔

''مول یار! تم تو بہت بہادر ہو۔ یار! کسی طرح میرا پیچھا اس لڑکے سے چھڑاؤ۔''

سائرہ کا اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ اگلے دن وہ چھٹی ہوتے ہی سائرہ کے بتانے پر سیدھی اسی لڑکے کے پاس پہنچ گئی اور جاتے ہی اسے دھمکانے لگی۔ وہ لڑکا اس صورت حال پر گھبرا گیا۔ اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور دوبارہ سائرہ کے لیے وہاں کھڑا نہیں ہوا، اس کی دوستوں نے اسے خوب شاباشی دی۔ لیکن سکول میں اس کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ شاید ان داستانوں میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا لیکن خوش قسمتی سے وہ سکول میں اس کا آخری سال تھا۔

کالج پہنچنے پر بھی اس نے اپنے طور طریقے نہیں چھوڑے۔ دوستوں کے لیے اس کے کارناموں میں وہاں بھی کمی نہیں آئی۔ ہر مشکل مرحلے پر وہ اسے ہی سامنے کرتیں اور وہ بلا خوف و خطر ڈٹ جاتی۔ بعد میں اس کی دوستیں اس کی بے تحاشا تعریفیں کرتیں۔

''بھئی، مجھے تو مول پر رشک آتا ہے۔ کتنی بولڈ ہے وہ، ہم تو لڑکوں کو دیکھتے ہی چھپنے لگتی ہیں۔ یہ اسی کی ہمت ہے کہ انہیں منہ توڑ جواب دیتی ہے۔ لڑکیوں کو اسی جیسا ہونا چاہیے۔''

تعریفوں کے یہ پل مول کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیتے۔ یونیورسٹی میں جانے کے بعد بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پہلی دفعہ وہ اور اس کی فرینڈز کو ایجوکیشن میں آئی تھیں۔ اس لیے کافی نروس تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی دوستوں نے پھر پرانے حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ جو لڑکا ان پر ریمارکس پاس کرتا وہ جواب دینے کے لیے مول کو آگے کر دیتیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پہلے سال ہی یونیورسٹی میں خاصی مشہور ہو گئی۔ لیکن یہ شہرت نیک نامی کے زمرے میں نہیں آتی تھی۔ لڑکے پہلے کی نسبت اب اس پر زیادہ ریمارکس

دیتے تھے۔

پھر انہیں دنوں ڈیپارٹمنٹ میں ایک لڑکے کے چرچے ہونے لگے اور یہ چرچے صرف لڑکیوں میں ہی نہیں لڑکوں میں بھی تھے۔ اسفند حسن کے لیے یونیورسٹی نئی نہیں تھی۔ چند ماہ پہلے اس نے اسی یونیورسٹی سے اکنامکس میں ماسٹرز میں ٹاپ کیا تھا اور اب وہ سی ایس ایس کی تیاری کے لیے دوبارہ کلاسز اٹینڈ کرنے کے لیے یونیورسٹی آنے لگا تھا۔ اور اس کی آمد نے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیوں کے درمیان بناؤ سنگھار کا ایک مقابلہ شروع کر دیا تھا۔ اور اس میں ان کا کوئی اتنا زیادہ قصور بھی نہیں تھا جس شخص کا نام اسفند حسن تھا۔ وہ واقعی دیکھنے کی چیز تھا۔ اس کی صرف پرسنالٹی ہی زبردست نہیں تھی بلکہ اس کا ذہن بھی کچھ غیر معمولی ہی تھا۔ سارے پلس پوائنٹ ہونے کے باوجود حیرت کی بات یہ تھی کہ یونیورسٹی میں اس کا کوئی سکینڈل کبھی مشہور نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ یونیورسٹی میں اس کی پرسنالٹی اور ذہانت کی وجہ سے اس کا شہرہ تھا۔ وہ مکمل تیاری کے ساتھ لیکچرز اٹینڈ کیا کرتا تھا اور کلاس میں اس کی موجودگی پروفیسرز کو خاصا چوکنا رکھتی تھی کیونکہ اس کی نالج کسی بھی چیز کے بارے میں بہت اپ ٹو ڈیٹ تھی اور وہ کسی بھی لمحہ کوئی بھی سوال کر سکتا تھا اور اس کے سوالات عام نہیں ہوتے تھے۔ وہ اکثر پروفیسرز کو مشکل میں ڈالتا رہتا تھا۔ سی ایس ایس کی تیاری کے سلسلے میں وہ انگلش ڈیپارٹمنٹ میں بھی ایک کلاس اٹینڈ کرنے آیا کرتا تھا اور اس کی آمد نے انگلش ڈیپارٹمنٹ میں اچھی خاصی ہلچل مچا دی تھی۔

جن دنوں اس نے آنا شروع کیا تھا۔ ان دنوں مومل بیمار تھی اور اس نے ایک ہفتہ کی چھٹی لی ہوئی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد جب وہ یونیورسٹی آئی تھی تو وہ اپنی دوستوں کی گفتگو سن کر حیران رہ گئی تھی۔ ان کی زبان پر بس ایک ہی بات تھی۔

”ہائے آج اسفند بلیک ڈینم میں کیسا لگ رہا تھا؟“

”اسفند پر گلاسز کتنے اچھے لگ رہے تھے۔“

مومل کو اس کے بارے میں سن سن کر اسے دیکھنے کا اشتیاق ہو گیا تھا۔ پھر جب وہ ان کے ڈیپارٹمنٹ میں آیا تو اس کی دوستوں نے بطور خاص اسے اسفند کا دیدار

کروایا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ بھی بہت متاثر ہوئی تھی۔ وہ واقعی مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ چند دن وہ بھی اپنی دوستوں کے ساتھ اس کے حسن اور پرسنالٹی کے قصیدے پڑھتی رہی اور اپنی دوستوں کی طرح ڈیپارٹمنٹ میں اس کی آمد کا انتظار کرتی رہتی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اس روٹین سے تنگ آ گئی۔ وہ یکسانیت پسند نہیں تھی لیکن اپنی دوستوں کی خاطر وہ اب بھی اس کے انتظار میں کھڑی ہوتی تھی کہ وہ ڈیپارٹمنٹ میں کب آتا اور کب جاتا ہے۔ وہ اپنی دوستوں کے ساتھ اس کلاس کے باہر کھڑی ہوتی کیونکہ اس کی دوست اکیلے وہاں نہیں کھڑی ہو سکتی تھیں اس لیے مومل جیسے ”جواں مرد“ کی موجودگی ضروری تھی۔ اسے مجبوراً ان کے ساتھ جانا پڑتا حالانکہ اس کے انتظار میں بے وقوفوں کی طرح آدھ گھنٹہ گزارنا اسے کافی مشکل لگنے لگا تھا۔ لیکن دوستی تو دوستی ہے۔ میں انہیں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ ہر بار یہی سوچتی۔ لیکن وہ یہ بات نہیں جانتی تھی کہ ان کا گروپ آہستہ آہستہ لوگوں کی نظروں میں آ رہا ہے۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں ان کے بارے میں سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ لیکن اس نے اس جانب زیادہ توجہ نہیں دی۔

اس دن وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ لائبریری میں شیکسپیئر کا ایک ڈرامہ لینے گئی تھی۔ اس ڈرامے کا اوریجنل ٹیکسٹ بازار میں دستیاب نہیں تھا۔ اور اس نے سوچا کہ جب تک وہ مارکیٹ میں نہیں آتا۔ وہ لائبریری سے اسے ایشو کروا کر پڑھ لے گی۔ جب وہ کاؤنٹر پر اپنی دوست کے ساتھ کتاب ایشو کروانے گئی تو اس نے دیکھا۔ اسفند بھی کچھ کتابیں ایشو کروا رہا ہے۔ اس کی دوست کچھ نروس ہو گئی تھی۔ اس کا اپنا دھیان بھی اس کی جانب تھا۔ اسی وقت لائبریرین اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ”میکبتھ کا اوریجنل ٹیکسٹ ہے لائبریری میں۔ شیکسپیئر کا مشہور ناول ہے؟۔“ اس نے کچھ نروس سے انداز میں لائبریرین سے پوچھا۔

اسفند نے رجسٹر پر سائن کرتے کرتے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی اس حرکت پر حیران ہوئی۔ کیونکہ اس سے اس کی کوئی جان پہچان نہیں تھی جو وہ اس طرح مسکراتا۔ مومل نے حیرانی سے اسے دیکھا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے نظر ہٹالی۔

”ایکسکیوزمی مس! شیکسپیئر نے میکبتھ نام کا کوئی ناول نہیں لکھا۔“ لائبریرین

کے بجائے اس نے اسفند کو کہتے سنا تھا۔

وہ سر گھما کر پھر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ فوری طور پر مومل کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے اپنی دوست پر نظر دوڑائی وہ بھی کچھ حیرت زدہ تھی۔

''آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ شیکسپیئر کا ناول میکبتھ ہمارے سیلبس میں شامل ہے۔'' مومل نے قدرے بلند آواز میں اس سے کہا تھا مگر وہ اسی طرح مسکراتا رہا۔

''آپ کے سیلبس میں شیکسپیئر کا کوئی ناول نہیں ہے۔ اس نے ایک بار پھر کہا۔ اس کا اصرار مومل کی سمجھ سے باہر تھا۔''

''میں شرط لگا کر کہتی ہوں کہ ہمارے سیلبس میں شیکسپیئر کا یہ ناول ہے۔''

اس بار وہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''چلیں ٹھیک ہے بیٹنگ (شرط) ہی سہی کیوں عمر! کیا شیکسپیئر نے اس نام سے کوئی ناول لکھا ہے؟'' اس نے بڑے معنی خیز انداز میں اپنے پاس کھڑے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس کے دوست نے بڑا مختصر سا جواب دیا تھا۔

''آپ نے سنا۔ عمر نے لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہے لیکن وہ شیکسپیئر کے ایسے کسی ناول کو نہیں جانتا۔ اب آپ ثابت کریں کہ شیکسپیئر نے اس نام کا کوئی ناول لکھا ہے۔''

وہ اب اس کی باتوں پر جھنجھلانے لگی۔

''آپ کو کچھ نہیں پتا۔ شیکسپیئر نے اس نام کا ناول لکھا ہے اور وہ ہمارے سیلبس میں بھی ہے بلکہ آپ ٹھہریں۔ میں آپ کو سیلبس دکھاتی ہوں۔''

بات کرتے کرتے اچانک اسے یاد آیا کہ اس کے بیگ میں پارٹ ون کا سیلبس موجود تھا۔

سیلبس نکال کر اس نے بڑے فخریہ انداز میں اسفند کے چہرے کے سامنے کر دیا۔

''اگر آپ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو آپ کو نظر آ جائے گا کہ یہ ناول اس سیلبس میں شامل ہے اور اسے شیکسپیئر نے ہی لکھا ہے۔''

لیکن اسفند نے سیلبس پر نظر دوڑانے کے بجائے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر میرے بجائے آپ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو آپ کو نظر آ جائے گا کہ یہ ناول نہیں play ہے اور شیکسپیئر ناول نہیں plays لکھتا تھا۔'' اس کے جملے پر مومل کو جیسے کرنٹ لگا۔ وہ جانتی تھی کہ شیکسپیئر نے ناول نہیں plays لکھے ہیں لیکن اس نے نروس ہو کر ایک واضح غلطی کی تھی اور بعد میں وہ اسی پر اڑی رہی۔ خجالت سے اس کا بُرا حال تھا۔ کسی طرف دیکھے بغیر خاموشی سے وہ لائبریری سے باہر آ گئی۔ اس کی دوست بھی اس کے پیچھے آ گئیں باہر آ کر وہ اپنی دوست پر دھاڑنے لگی۔

''تمہیں مجھے میری غلطی کے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا۔ تم منہ بند کر کے سارا تماشا دیکھتی رہیں۔''

اس کی دوست اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

''یار! مجھے تو خود پتا نہیں تھا۔ مجھے کیا اندازہ کہ وہ کس حوالے سے بات کر رہا ہے ورنہ میں تمہیں کبھی اس بحث میں انوالو نہ ہونے دیتی۔ ویسے یار! دیکھو اس نے کس طرح تمہاری غلطی کو پکڑا ہے۔ مگر میں تو حیران ہوں کہ اس نے تم سے بات کیسے کر لی۔ مجھ سے بات کرتا تو میں تو فوت ہی ہو جاتی۔''

عالیہ کی بات پر مومل کا پارہ اور چڑھ گیا۔ وہ کافی دیر عالیہ پر برستی رہی خجالت سے اس کا بُرا حال تھا اور اسی خجالت کے مارے وہ اگلے دن یونیورسٹی نہیں گئی۔

تیسرے دن جب وہ یونیورسٹی گئی تو اس کی دوستیں اسے دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائی تھیں۔

''تمہارے لیے ایک تحفہ بھیجا ہے اسفند نے۔''

وہ عالیہ کی بات پر حیران رہ گئی۔

سائرہ نے اسے ایک کتاب تھما دی۔

''تم تو کل آئی نہیں تھیں مگر اسفند آیا تھا اور یہ ڈرامہ دے کر کہنے لگا کہ اپنی دوست کو یہ ''ناول'' میری طرف سے دے دیجئے گا۔''

وہ سائرہ کی بات پر یک دم بگڑ گئی۔ ''اور تم نے خاموشی سے یہ کتاب تھام لی۔

وہ میرا مذاق اڑا رہا تھا اور تم لوگوں نے ذرا پروا نہیں کی۔"

"صرف کتاب نہیں اس کے اندر ایک خط بھی ہے۔ تمہارے لیے۔ وہ پڑھو پھر غصہ کرنا۔" فاریہ نے ہنس کر کہا۔

مومل نے کچھ پریشانی کے عالم میں خط نکالا۔

مائی ڈیئر مومل!

میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں نہیں جانتا۔ یہ سب کیسے ہوا لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ تم وہ پہلی لڑکی ہو جس سے مجھے محبت ہوئی ہے۔ اب میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو اور اب میں تمہاری جانب سے جواب کا انتظار کروں گا۔ مجھے یقین ہے' تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔

تمہارا اور صرف تمہارا اسفند

خط پڑھ کر اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ "اس کمینے کی اتنی جرأت کہ وہ مجھے اس قسم کے محبت نامے بھیجے۔"

"ہم تو خود اس کو دیکھ کر حیران ہو گئے تھے۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ یہ خط خود جا کر اس کے منہ پر مارتے ہیں لیکن پھر ہم نے سوچا کہ ہمارا یہ کرنا بہتر نہیں ہو گا جو کچھ کرنا چاہیے۔ تم کو کرنا چاہیے تاکہ اسے اندازہ ہو جائے کہ تم ایسی ویسی لڑکی نہیں ہو اور ہو سکتا ہے' وہ تم سے معذرت بھی کر لے۔ اس وقت وہ کیفے ٹیریا میں بیٹھا ہو گا۔ تم وہیں جا کر اس سے بات کرو' ذرا اسے پتا تو چلے کہ تم کیا ہو۔"

اس نے فاریہ کے مشورے پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور سیدھا کیفے ٹیریا میں پہنچ گئی۔ بڑی آسانی سے اس نے اسفند کو وہاں پا لیا تھا۔ اسفند اسے اپنی جانب آتے دیکھ کر مسکرایا اور اس کی اس مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مومل نے اس کی میز پر پہنچ کر کتاب کھینچ کر اس کے منہ پر دے ماری۔

"تم نے کیا سمجھ کر مجھے یہ کتاب دی ہے؟" وہ بلند آواز میں چلائی۔ اسفند نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھا تھا اور جب اس نے ہاتھ ہٹایا تو خون کے چند قطرے اس کی ہتھیلی پر نظر آ رہے تھے۔ اس کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا۔ اردگرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے

لوگ ان کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ "میں نے یہ play آپ کو اس لیے دیا تھا کیونکہ آپ کو اس کی ضرورت تھی۔ صرف نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ۔ اس کے علاوہ میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔ اگر آپ کو یہ بات اچھی نہیں لگی تو آپ بڑے آرام سے یہ کتاب واپس کر سکتی تھیں۔ اس قسم کی بے ہودگی کی ضرورت نہیں تھی۔"

اس نے بہت سرد لہجے میں اس سے کہا تھا مگر اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں تک اس کی آواز پہنچے۔ مومل پر اس کے لہجے کی سختی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے ایک بار پھر وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا خط اس پر اچھال دیا۔

"یہ لو لیٹر تم نے کون سے خلوص کے اظہار کے لیے دیا ہے؟"

وہ جیسے اس کی بات پر دم بخود رہ گیا تھا۔ "میں نے کوئی لو لیٹر نہیں لکھا۔"

"تو کیا یہ تمہارے فرشتوں نے لکھا ہے۔ تم نے کیا سوچا کہ تم مجھے پھنسا لو گے اس طرح کے خط بھیج کر؟"

"میرے پاس ان خرافات کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں یونیورسٹی اس لیے نہیں آتا اور جہاں تک تمہیں پھنسانے کا تعلق ہے تو مجھے خط لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو پہلے ہی میرے انتظار میں کھڑی رہتی ہو۔" اسفند نے بہت تلخ لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔

مومل کے جسم میں جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ کیفے ٹیریا میں یک دم جیسے سناٹا چھا گیا۔ اسفند حسن اپنے گال پر ہاتھ جمائے کھڑا تھا اور وہ چیلنج کرنے والے انداز میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"اس تھپڑ کے لیے تم ساری عمر پچھتاؤ گی۔"

اسفند نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ کہا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔

"کیا کرو گے تم؟" وہ اس کے تاثرات سے خائف نہیں ہوئی۔

"یہ تم بہت جلد جان جاؤ گی۔" ٹیبل پر پڑی ہوئی کتابیں اٹھا کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کیفے ٹیریا سے نکل گیا۔

مومل پر اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ واپس اپنی دوستوں کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ چلی گئی۔ اور انہیں سارے واقعات سنا دیئے۔

''مومی! تم نے اسے تھپڑ کیوں مارا؟'' فاریہ اس کی بات سن کر چیخ پڑی۔

''کیوں نہ مارتی۔ وہ بے ہودہ بکواس کر رہا تھا۔ کیا میں اتنے لوگوں کے سامنے اپنی رسوائی برداشت کرتی اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا نہ تم لوگ اس کے لیے کلاسز کے باہر کھڑی ہوتیں اور نہ مجھے تم لوگوں کے ساتھ جانا پڑتا۔'' وہ اپنی دوستوں پر برس پڑی۔

''مومی......! ہم نے تمہارے ساتھ صرف ایک مذاق کیا تھا کیونکہ آج اپریل فول تھا اور تم نے بغیر سوچے سمجھے اتنی بڑی حماقت کر دی۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد یک دم عالیہ نے اس سے کہا۔ مومل کو یوں لگا جیسے اس کے پاس کوئی بم پھٹا ہو۔ اس نے بے یقینی سے فاریہ اور عالیہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''وہ خط اقصیٰ نے لکھا تھا اسفند نے نہیں' تم نے اس کی ہینڈ رائٹنگ بھی نہیں پہچانی۔ تم بھی بعض دفعہ حد کر دیتی ہو۔''

مومل کا پارہ اس وقت آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے پہلی بار اپنی دوستوں کو بے نقط سنائیں۔ وہ وضاحتیں پیش کرتی رہیں مگر اس نے کوئی وضاحت قبول نہیں کی تھی۔ چند منٹوں پہلے کا منظر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا اور اس کی خلش بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر اس کا دل یونیورسٹی میں نہیں لگا تھا۔ دوستوں کے روکنے کے باوجود وہ وہاں نہیں رکی اور پوائنٹ کی طرف چلی گئی۔ اپنے گھر کے پاس وہ حسب معمول بس سے اتری تھی اور پھر مین روڈ سے بائی روڈ پر مڑ گئی۔ اس کا ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس نے سفید رنگ کی اس ہونڈا پر بھی غور نہیں کیا تھا جس نے گھر تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ گھر آ کر بھی اس کی پریشانی کم نہیں ہوئی تھی اس کا ضمیر اسے مسلسل لعنت ملامت کر رہا تھا۔

''میں نے غلطی کی اور ٹھیک ہے۔ میں کل اسفند سے معذرت کر لوں گی۔''

رات کو سونے سے پہلے اس نے فیصلہ کیا تھا اور پھر بڑی جدوجہد کے بعد سونے میں کامیاب ہو گئی۔

اگلے دن صبح حسب معمول تیار ہوئی تھی اور مقررہ وقت پر پوائنٹ پکڑنے کے لیے گھر سے باہر بائی روڈ پر آ گئی۔ وہ ابھی مین روڈ سے کافی دور تھی جب بہت تیزی سے ایک گاڑی یک دم اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اس نے حیران ہو کر اس سیاہ رنگ کی گاڑی کو دیکھا جس کا فرنٹ ڈور کھلا تھا۔ اور سفید شلوار قمیض میں ملبوس ایک دراز قد نوجوان اس کے قریب آ گیا تھا۔

''آپ مومل عباس ہیں؟'' بہت شستہ لہجے میں اس سے پوچھا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے وہ صرف اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

''آپ کون ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''تعارف کی ضرورت نہیں ہے' آپ بس اتنی زحمت کریں کہ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ سڑک پر آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی جائے۔''

مومل اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سن کر دھک سے رہ گئی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر دو اور لمبے تڑنگے آدمی اس کے اطراف میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ فق ہوتی ہوئی رنگت کے ساتھ اس نے کسی مدد کی آس میں سڑک کو دیکھا تھا۔

''اگر آپ کو یہ امید ہے کہ سڑک سے کوئی گاڑی گزرے گی اور آپ شور مچا کر اسے متوجہ کر لیں گی تو ایسا نہیں ہو گا۔ اس بائی روڈ کے دونوں اطراف میں دو گاڑیاں ہیں اور وہ کسی کو بھی اس وقت تک اس سڑک پر آنے نہیں دیں گی۔ جب تک ہم یہاں سے چلے نہیں جاتے اس لیے آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔''

اس بار اس کا لہجہ بے حد سخت تھا۔ اس نے مومل کے اطراف کھڑے ہوئے آدمیوں کو کوئی اشارہ کیا تھا اور ایک آدمی نے اسے گاڑی کے دروازے کی طرف دھکیل دیا تھا دوسرے آدمی نے کہیں سے ایک ریوالور برآمد کیا تھا اور اس پر تان دیا۔ سفید شلوار قمیض والا نوجوان کچھ کہے بغیر پُرسکون انداز میں دوبارہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ وہ بھی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ وہ دونوں آدمی اس کے دائیں بائیں

بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ دائیں طرف بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنی جیب سے ایک سیاہ پٹی نکال کر اس کی آنکھوں پر باندھ دی۔ اسے پوری دنیا اندھیرے میں ڈوبتی محسوس ہوئی۔

''تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟'' کانپتی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا۔

''آپ کو بہت جلد پتا چل جائے گا۔'' اس نوجوان کی آواز ابھری تھی۔

''میرے بھائیوں کو پتا چل گیا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ سرکاری افسر ہیں۔ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔'' اس نے انہیں دھمکانے کی کوشش کرنا چاہی تھی۔

''اچھا۔'' جواب ایک بار پھر مختصر تھا۔ مومل کا دل رونے کو چاہا۔

''تم مجھے اسفند کے پاس لے کر جا رہے ہو؟'' اس نے ایک بار پھر پوچھا۔

گاڑی میں اس بار خاموشی رہی۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے آنکھوں سے پٹی ہٹانی چاہی مگر اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ پٹی اتارنے کی کوشش کر رہی ہے۔'' اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے بلند آواز میں کہا۔

''اب ایسا کرے تو اس کے منہ پر تھپڑ مارنا۔'' اسی نوجوان نے کرخت آواز میں کہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مومل نے اپنا ہاتھ نیچے کر لیا۔ وہ دوبارہ ہاتھ پٹی تک لے جانے کی ہمت نہیں کر پائی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ زور زور سے چیخ دھاڑیں مار مار کر روئے لیکن وہ اپنے آنسوؤں کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

پہلی دفعہ اسے صحیح معنوں میں اپنے کیے پر پچھتاوا ہوا تھا۔ وہ اندازہ نہیں کر سکی گاڑی کتنی دیر چلتی رہی۔ اس کے لیے گویا یہ قیامت کا سفر تھا۔ پھر گاڑی رک گئی تھی۔ اس کا دروازہ کھولا گیا اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی سے اتارا۔ مومل نے دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھوں کی پٹی اتارنی چاہی مگر ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا گیا۔

''اسے ابھی آنکھوں پر ہی رہنے دو۔'' اس نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہا تھا پھر اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ اسے کسی گھر کے اندر لے گیا۔

مومل کو بار بار دروازے بند ہونے اور کھلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اچانک اس نے مومل کا ہاتھ چھوڑ کر اس کی پٹی اتار دی۔ چند لمحوں تک مومل کو کچھ نظر نہیں آیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اردگرد کا منظر واضح ہونے لگا۔ اس کے پاس کھڑا نوجوان بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مومل کو اس کی نظروں سے خوف آنے لگا۔

''تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' چند قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

''میں کون ہوں۔ تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں۔ یہ جاننے کے لیے تم کچھ دیر انتظار کرو۔''

وہ کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے گئی اور دروازے کے ہینڈل کو گھمانے لگی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ شاید وہ اسے باہر سے لاک کر گیا تھا اور یہ چیز اس کے لیے خلاف توقع نہیں تھی۔ پھر اس نے دروازہ کا ہینڈل چھوڑ دیا۔ اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ شاید وہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ وہ ایک کشادہ اور ویل فرنشڈ کمرہ تھا۔ کمرے کی ایک دیوار میں اسے کھڑکیاں بھی نظر آئیں۔ وہ تیزی سے ان کی طرف گئی اور پردے کھینچ کر وہ ایک بار پھر مایوس ہو گئی تھی۔ کھڑکیوں کے باہر گرل لگی ہوئی تھی اور کھڑکیوں سے نظر آنے والے منظر نے اسے ہولا دیا تھا۔ اسے شہر سے باہر کسی فارم ہاؤس میں رکھا گیا تھا۔ باہر دور دور تک کھیت سبزہ اور درخت نظر آ رہے تھے۔

اس نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور اس بار اس نے اپنی آواز دبانے کی کوشش نہیں کی۔ کمرے میں پاگلوں کی طرح چکر لگاتے ہوئے وہ بلند آواز میں روتی رہی مگر اس کی آواز سن کر کوئی اندر نہیں آیا تھا۔ دوپہر کا کھانا وہی سفید شلوار قمیض والا نوجوان لے کر آیا تھا اور خاموشی سے اندر رکھ کر چلا گیا وہ روتے ہوئے اس کے پیچھے گئی مگر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ بہت دیر تک زور زور سے دروازہ بجاتی رہی۔ اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب رہا تھا کہ جب گھر میں اس کی گمشدگی کا پتا چلے گا تو کیا ہوگا۔ روتے روتے خود ہی اس کے آنسو تھم گئے تھے۔ وہ سر

پکڑ کر ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔

شام کے سات بجے اس نے ایک بار پھر دروازہ کے باہر قدموں کی چاپ سنی تھی دروازہ کھلا تھا اور ایک آدمی کھانے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے وہی نوجوان تھا۔ اس آدمی نے میز پر کھانے کی ٹرے رکھ دی اور اس پر پہلے سے موجود دوپہر کے کھانے کی ٹرے اٹھالی۔

''آپ نے کھانا نہیں کھایا؟'' اس نوجوان نے بہت نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔ مومل کو اس کے لہجے سے جیسے شہ مل گئی۔ وہ بلند آواز سے بولنے لگی۔

''مجھے کھانا نہیں کھانا۔ گھر جانا ہے۔ تم مجھے گھر جانے دو۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔'' مومل نے یک دم کمرے کے دروازے سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش کا نتیجہ ایک زبردست تھپڑ کی صورت میں نکلا تھا۔

''میں عام طور پر عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا مگر بعض عورتوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ جیسے تمہارے لیے۔ تمہیں یہاں جس شخص کے کہنے پر لایا ہوں' صرف وہی تمہیں یہاں سے نکال سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں۔ اس لیے تم اپنا شور شرابا بند کر دو۔ جس جگہ پر تم ہو یہاں میرے علاوہ تین اور آدمی ہیں اور تینوں میں سے کوئی بھی تمہارا ہمدرد نہیں ہے اس لیے کسی سے مدد کی توقع مت رکھو۔''

وہ حلق میں اٹکے ہوئے سانس کے ساتھ دہشت زدہ اس کی باتیں سنتی رہی۔ وہ اپنی بات ختم کر کے اس آدمی کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ اسے ایک بار پھر رونا آ گیا تھا۔

''پتا نہیں' گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ پتا نہیں بھائی مجھے کہاں کہاں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔'' اس کا ذہن جیسے سوچوں کا گرداب بن گیا تھا۔

تیسری دفعہ کمرے کا دروازہ رات گیارہ بجے کھلا تھا اور آنے والے کو دیکھ کر اس کا سانس رک گیا تھا۔ اسے شک تو تھا کہ اسے اسفند کے کہنے پر اغوا کیا گیا ہے مگر اغوا کرنے والوں نے اس کی بات کی نہ تصدیق کی تھی نہ تردید' اس لیے اس کا شبہ یقین میں نہیں بدلا تھا یا شاید اسے توقع نہیں تھی کہ اسفند حسن جیسا شخص ایسی گھٹیا حرکت کر سکتا تھا۔ اور اب ...... اب اسفند حسن اس کے سامنے تھا۔ اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا یوں

جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو۔ وہ ستے ہوئے چہرے' سوجھی آنکھوں اور ٹھنڈے ہوتے ہوئے وجود کے ساتھ اسے کمرے میں آتا دیکھتی رہی۔

''تو مومل عباس! کوئی بات کریں۔ کچھ کہیں۔ میرے عشق میں کتنی طاقت تھی جو آپ کو یہاں کھینچ لایا ہے۔''

اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور لہجے میں زہر تھا۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے گھر جانے دو۔''

وہ یک دم گھٹنوں کے بل گر کے رونے لگی۔

''میں گھر بھجوا دوں گا۔ تمہیں اپنے پاس رکھ کر مجھے کرنا ہی کیا ہے۔ ہاں بس جب تم واپس جاؤ گی تو اتنی ہی ذلت اور رسوائی ساتھ لے کر جاؤ گی۔ جتنی کل میں یونیورسٹی سے لے کر گیا تھا۔'' وہ اس کے قریب آ گیا۔

''جو کچھ میں نے کل کیا' وہ غلط تھا۔ مجھے اس پر افسوس ہے میں ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگتی ہوں۔'' اس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''جو کچھ میں آج کروں گا' مجھے اس پر کبھی بھی افسوس نہیں ہوگا کیونکہ تم اس کی مستحق ہو۔''

مومل نے روتے روتے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہ اس کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ نہیں سکی۔ فرار آسان نہیں ہوتا نہ زندگی سے نہ قسمت سے نہ ان حرکتوں سے جو ہم خود کو عقل کل سمجھ کر کرتے ہیں۔ ہر شخص کو گرنے کے لیے ٹھوکر کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض ٹھوکر لگے بغیر ہی گر جاتے ہیں پھر انہیں اٹھانے کے لیے کوئی ہاتھ بڑی مشکل سے ہی آگے بڑھتا ہے۔

وہ صبح بے حد خاموشی سے باہر چلا گیا تھا اور اندر وہ دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔ اس رات کے بعد وہ دوبارہ اس کے پاس نہیں آیا۔ تیسرے دن وہ صبح کے وقت آیا اور وہ اسے دیکھ کر ایک بار پھر خوفزدہ ہوگئی۔

''تم کھانا کیوں نہیں کھاتیں؟'' اس بار اس کا لہجہ اور انداز دونوں بدلے ہوئے تھے۔

”مجھے گھر جانے دو۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ خدا کے لیے مجھے گھر جانے دو۔“
اس نے روتے ہوئے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”ٹھیک ہے اگر تم گھر جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔ مگر پہلے تم کھانا کھاؤ اور کپڑے تبدیل کرلو۔“

وہ ایک پیکٹ اس کی طرف اچھال کر چلا گیا۔ وہ بجلی کی تیزی سے کپڑے بدل کر کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ چند لقمے زہر مار کرنے کے بعد وہ پھر اٹھ گئی۔ اس کے بعد وہ کسی کی آمد کا انتظار کرتی رہی مگر کوئی نہیں آیا۔ اگلی صبح اسے اسی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھر سے لے جایا گیا۔ اور پھر اس کو گھر کے پاس چھوڑ دیا گیا۔

مومل بازوؤں میں منہ چھپائے رو رہی تھی اور فاطمہ جیسے سکتہ کے عالم میں تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اب مومل کو چپ کروانے کی کوشش کرتی۔ ربیعہ بھی گم صم تھی۔ پھر اچانک فاطمہ بھی مومل سے لپٹ کر رونے لگی' شاید اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ ربیعہ کچھ دیر تک ان دونوں کو روتے دیکھتی رہی پھر اس نے نرمی سے فاطمہ کو مومل سے علیحدہ کیا تھا۔

”مومل! تم چپ ہو جاؤ۔ رونے سے کیا ہوگا۔ جو کچھ ہو چکا ہے' اسے بھول جاؤ۔ وہ ماضی ہے' اب آئندہ کا سوچو' تمہارے آگے پوری زندگی پڑی ہے۔ دنیا ختم تو نہیں ہوگئی۔“

”کیا میری دنیا ختم نہیں ہوگئی۔“ مومل نے روتے روتے سر اٹھا کر اس سے کہا۔ اس کی شکل دیکھ کر ربیعہ کے دل کچھ ہوا مگر اس نے ایک بار پھر خود پر قابو پا لیا۔

”مومل! خود کو سنبھالو۔ جو کچھ ہو چکا ہے' اسے تم نہیں بدل سکتیں مگر جو زندگی آئندہ تمہیں گزارنی ہے۔ اس کے بارے میں تو سوچ سکتی ہو۔“

”زندگی؟ کون سی زندگی؟ میرے گھر والوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ کوئی رشتہ دار مجھے پناہ دینے کو تیار نہیں۔ میری بات پر کسی کو اعتبار ہی نہیں آتا۔“

ربیعہ نے اس کی بات پر ایک طویل سانس لی۔

”مومل! صرف رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔ ہم

تمہارے گھر والوں سے بات کریں گے۔ ہم یہ نہیں بتائیں گے کہ تمہارے ساتھ کوئی غلط حرکت ہوئی ہے۔ یہ کہیں گے کہ تمہیں کسی اور لڑکی کے دھوکے میں اغوا کیا گیا تھا اور جب اغوا کرنے والوں کو حقیقت کا پتا چلا تو انہوں نے تمہیں چھوڑ دیا۔“

”اور اگر انہوں نے پھر بھی مجھے نہ رکھا تو؟“ مومل نے ربیعہ سے پوچھا۔ وہ فاطمہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”تو پھر کچھ نہیں۔ ہم لوگ تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں سڑک پر نہیں پھینکیں گے۔“

ربیعہ نے قطعی لہجے میں کہا۔ مومل حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی کہ یہ بات فاطمہ کہتی تو شاید اسے حیرت نہ ہوتی لیکن ربیعہ کے منہ سے یہ بات اسے بڑی عجیب لگی تھی۔ اس کی ربیعہ سے صرف سرسری سی جان پہچان تھی۔ وہ فاطمہ سے ملنے آتی اور ربیعہ سے بھی سلام دعا ہو جاتی کیونکہ وہ فاطمہ کی روم میٹ تھی اور اس کی بہت اچھی دوست بھی تھی اور اس وقت وہ اس کے لیے جیسے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھی۔ اس نے زبردستی مومل کو کھانا کھلایا تھا اور پھر اسے نیند کی گولی دے کر سلا دیا۔ پھر وہ فاطمہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”اب کیا ہوگا ربیعہ! اب کیا ہوگا؟ مومل زندگی کیسے گزارے گی؟ کیسے رہے گی؟“ فاطمہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے کہا تھا۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا صرف ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے اور افسوس کرنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ تم اب اس کے سامنے رونا مت۔ تمہارے آنسو اسے اور ڈپریس کر دیں گے۔ جو کچھ ہو چکا ہے' ہم اسے بدل نہیں سکتے لیکن اسے تسلی اور دلاسا تو دے سکتے ہیں۔ بار بار وہی بات دوہرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ صبح ہم ہاسپٹل جانے سے پہلے اس کے گھر جائیں گے اور اس کی بھابھیوں سے بات کریں گے۔ ہوسکتا ہے وہ اسے رکھنے پر تیار ہو جائیں ورنہ دوسری صورت میں ہم اسے کسی ہاسٹل میں داخل کروا دیں گے۔ کچھ روپے میرے پاس ہیں اور کچھ تم دے دینا۔ ہم بہت آسانی سے اس کے اخراجات اٹھا سکتے ہیں پھر وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے گی تو اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔“

ربیعہ نے جیسے سب کچھ پہلے سے طے کر رکھا تھا۔ فاطمہ پر سوچ انداز میں

سر ہلا کر رہ گئی۔

دوسرے دن وہ مومل کے گھر گئیں لیکن مومل کی بھابیوں کے چہرے کے تاثرات نے انہیں بتا دیا کہ وہ اب مومل کی کسی دوست سے ملنا نہیں چاہتیں اور جب انہیں ان کی آمد کا پتا چلا تو وہ یک دم غضب ناک ہو گئیں۔ ان کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ وہ اپنے سارے دلائل دل میں لیے واپس آ گئیں۔ جب مقابل بات کرنے پر تیار نہ ہو تو اسے قائل کرنا تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ بجھے دل کے ساتھ انہوں نے مومل کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ زرد چہرے کے ساتھ گم صم ان کی باتیں سنتی رہی۔

”ان کا قصور نہیں ہے۔ وہ بھی مجبور ہیں اگر مجھے گھر میں رکھیں گی تو خاندان والے ان کا جینا حرام کر دیں گے اور بھائی تو شاید مجھے قتل ہی کر دیں۔“

”وہ مجبور نہیں ہیں۔ ڈرامہ کر رہی ہیں۔ صرف تم سے جان چھڑانا چاہتی ہیں اگر یہ ان کی اپنی بیٹی کے ساتھ ہوا ہوتا تو کیا وہ اسے بھی اسی طرح گھر سے نکال دیتیں۔“

ربیعہ غصے میں آ گئی تھی اس کی بات سن کر۔

”یہ سب اس ذلیل شخص کی وجہ سے ہوا ہے اگر وہ یہ سب نہ کرتا تو کوئی مجھے گھر سے نکال نہیں سکتا تھا۔“ وہ جانے کس طرح خود پر ضبط کیے بیٹھی تھی مگر ربیعہ کی بات نے اسے پھر رلا دیا۔ فاطمہ اسے چپ کروانے لگی۔

ایک ہفتے تک وہ اسی طرح رہی تھی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے بغیر کسی وجہ کے رونا شروع کر دیتی اور کبھی اسفند کو گالیاں دینے لگتی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے نارمل ہونا شروع کر دیا۔ ایک ورکنگ ویمن ہاسٹل میں ربیعہ نے اسے کمرہ لے دیا اور اس نے ایک بار پھر اپنی تعلیم پر توجہ دینے کی کوشش کرنی شروع کر دی۔ یونیورسٹی جانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی اور پھر وہاں وہ شخص اسفند حسن بھی ہوتا اور اس کا وجود اسے خوف میں مبتلا کیے رکھتا۔ اس نے پرائیویٹ طور پر امتحان دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ربیعہ اور فاطمہ تقریباً ہر روز اس کے پاس آتی تھیں اور پھر باتیں کر کے اس کا دل بہلایا کرتیں۔ کبھی وہ اسے اپنے ساتھ گھمانے کے لیے لے جاتیں۔ ان دونوں کا وجود اس کے لیے بہت سکون بخش تھا۔ اسے بعض

دفعہ حیرت ہوتی تھی کہ وہ دونوں اس پر اتنی توجہ، اتنی محبت کیوں دے رہی تھیں۔ وہ اس کے گھر والوں اور دوسرے دوستوں کی طرح بھاگی کیوں نہیں۔ انہوں نے اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ بہر حال وہ ان کی ذمہ داری تو نہیں تھی اور نہ ہی ان پر اس کا کوئی حق تھا مگر ساری سوچیں اس کے وجود کو ان دونوں کے احسانوں کے قرض میں جکڑ دیتیں۔

ان ہی دنوں اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ شروع میں اس نے اتنا دھیان نہیں دیا مگر ربیعہ ایک دن اسے زبردستی ہاسپٹل لے کر گئی اور اس کے ٹیسٹ کروائے اور ٹیسٹوں کی رپورٹس نے ان تینوں پر جیسے سکتہ کر دیا تھا۔ مومل پریگنینٹ تھی۔ جس حادثے کو وہ بھول جانے کی کوشش کر رہی تھی وہ ایک بار پھر ایک بھیانک سچائی کی طرح اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ربیعہ! اب کیا ہو گا؟“ کسی ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح وہ ایک بار پھر ربیعہ کو پکار رہی تھی۔ ربیعہ بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ ہر قدم پر اس کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔

”تم پریشان مت ہو مومل! میں کچھ سوچوں گی کہ تمہیں اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا دلایا جائے۔“

ربیعہ اور فاطمہ اسے تسلیاں دیتی ہوئی واپس آ گئیں۔

”ربیعہ! اب کیا ہو گا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ فاطمہ نے ہاسٹل واپس آتے ہی سر پکڑ لیا۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہم اسے ایسے ہی تو نہیں چھوڑ سکتے مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم کریں کیا؟“ ربیعہ بھی اسی کی طرح الجھی ہوئی تھی۔

”ربیعہ! ربیعہ، کیوں نہ ہم اس لڑکے کے پاس جائیں اور اس سے کہیں کہ وہ مومل سے شادی کر لے۔“ ربیعہ حیرانی سے فاطمہ کی بات پر اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”کس قدر احمقانہ خیال ہے تمہارا۔ وہ اس قدر رحم دل ہوتا تو یہ سب کچھ کرتا کیوں؟ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہمارے کہنے پر وہ شادی پر تیار ہو جائے گا۔“

”ربیعہ! کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہوسکتا ہے، وہ ہماری بات مان جائے

اور اگر وہ نہ مانا تو کم از کم ہم اسے اس بات پر مجبور کریں گے کہ مول کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلوائے۔ ہم اسے دھمکی دیں گے کہ ہم یہ معاملہ اس کے گھر لے کر جائیں گے۔''

ربیعہ الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ہمارے پاس تو اتنے روپے نہیں ہیں کہ ہم اس کو چھٹکارا دلا سکیں۔ مگر وہ تو مول کی مشکل حل کر سکتا ہے ذرا سوچو تو؟'' وہ ربیعہ کو قائل کرنے پر تلی تھی۔

''تمہاری یہ تجویز کتنی موثر ثابت ہوتی ہے' میں نہیں جانتی مگر ٹھیک ہے ایک بار ٹرائی کر لیتے ہیں۔'' ربیعہ نے بے دلی سے کندھے اچکا دیئے۔

اگلے دن وہ دونوں یونیورسٹی چلی گئیں۔ مختلف ڈپارٹمنٹس سے اس کے بارے میں پوچھتے پوچھتے وہ اس تک پہنچ ہی گئیں۔ وہ لائبریری میں بیٹھا تھا۔ چند لمحوں تک وہ بھی اس پر سے نظر نہیں ہٹا سکیں۔ وہ واقعی خطرناک حد تک مردانہ حسن کا مالک تھا۔ اور کسی لڑکی کا اسے دیکھ کر اس پر فدا ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔

''آپ کا نام اسفند حسن ہے؟'' ربیعہ نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

اس نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔ ''ہاں۔''

''ہمیں آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

ربیعہ کی بات پر اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے کریں۔''

''دیکھیں آپ پلیز باہر آ کر ہماری بات سن لیں۔ ہم ان کے سامنے بات کرنا نہیں چاہتے۔'' ربیعہ نے کچھ جھجکتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوستوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد اٹھ کر ان کے ساتھ باہر آ گیا۔ ربیعہ نے باہر آنے کے بعد مختصر لفظوں میں اپنا اور فاطمہ کا تعارف کرایا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا۔

''ہم آپ سے مول کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔'' تعارف کرواتے ہی ربیعہ بلاتوقف اصل موضوع پر آ گئی۔ اسفند کے چہرے کا رنگ یک دم بدل گیا۔

''اس کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟ اور آپ کا اس سے کیا تعلق ہے۔'' اس نے سرد لہجے میں ان سے پوچھا تھا۔

''اس سے ہمارا کیا تعلق ہے' اسے جان کر آپ کیا کریں گے۔ ہم تو آپ کو صرف یہ اطلاع دینے آئے ہیں کہ وہ پریگنٹ ہے۔''

''کیا؟'' ربیعہ کی بات پر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا اور چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہیں پایا۔

''اتنی حیرت کس بات پر ہے آپ کو؟ جو کچھ آپ نے کیا تھا۔ کیا اس کے بعد ایسی کوئی خبر حیرت انگیز ہو سکتی ہے؟''

ربیعہ کا لہجہ بے حد کٹیلا تھا۔ وہ اس کی بات پر چند لمحوں تک کسی سوچ میں گم رہا اور پھر اس نے یک دم تیز آواز میں کہنا شروع کر دیا۔

''میں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے اور کیوں کیا ہے' یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ آپ کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ جو ہوا' وہ اس کی مستحق تھی۔ اب اگر وہ پریگنٹ ہے تو یہ اس کا مسئلہ ہے میرا نہیں۔ اس لیے مجھے اس اطلاع سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ کو میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''کیوں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ بچہ جائز ہے یا ناجائز۔ اولاد تو تمہاری ہی ہے۔ پھر سارے نقصان وہ اکیلی کیوں برداشت کرے۔ تم اس سے شادی کرو۔'' فاطمہ یک دم بیچ میں بولنے لگی تھی۔

''آپ پاگل ہو گئی ہیں۔ میں اور اس سے شادی کروں' یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔'' اسفند کا لہجہ قطعی تھا۔

''ٹھیک ہے پھر ہم اسے تمہارے گھر بھجوائیں گے تاکہ وہ تمہاری فیملی کو تمہارے کرتوتوں کے بارے میں بتائے۔'' فاطمہ کا لہجہ بے حد تلخ ہو گیا تھا۔

''تم لوگ ایسا نہیں کر سکتیں۔''

''کیوں نہیں کر سکتے اگر تم کسی کی زندگی تباہ کر سکتے ہو تو ہم کیا کسی کو یہ سب بتا نہیں سکتے۔ تمہیں بھی پتا چلنا چاہیئے ذلت اور رسوائی کیا ہوتی ہے۔'' فاطمہ ایک بار پھر

بول اٹھی تھی۔

"دیکھو۔ میری منگنی ہو چکی ہے' اس سال کے آخر میں میری شادی ہونے والی ہے۔ میں اس سے شادی نہیں کرسکتا۔ اگر میری فیملی کو یہ سب کچھ پتا چل گیا' تب بھی میں ان کی نظروں سے گر ضرور جاؤں گا مگر وہ میری شادی وہیں کریں گے۔ وہ موبل کو میری بیوی کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اس لیے تم اس حوالے سے مجھے بلیک میل مت کرو۔ مگر ہاں ٹھیک ہے۔ مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے میں اس کا تاوان دے سکتا ہوں۔ اسے جتنے روپے کی ضرورت ہے وہ لے لے اس مصیبت سے چھٹکارا پالے میں اب اس کی صرف یہی مدد کرسکتا ہوں۔"

اسفند کے لہجے میں ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ اس کی آواز اب بہت دھیمی ہو چکی تھی۔

"اسفند! کبھی انسان بن کر سوچو تو تمہیں خیال آئے گا کہ تم جسے مارنے کی بات کر رہے ہو' وہ تمہاری اپنی اولاد ہے' اپنی اولاد کو تو صرف سانپ کھاتا ہے مگر وہ بھی اسے دنیا میں ضرور آنے دیتا ہے۔ تم تو سانپ سے بھی گئے گزرے ہو۔ تمہاری وجہ سے ایک لڑکی کی زندگی برباد ہوئی ہے اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ ہم نے اسے سہارا دیا ہے مگر کب تک۔؟ اور تم ایک بات یاد رکھنا ہم نے اسے سہارا ضرور دیا ہے۔ مگر تمہاری اولاد کو نہیں دیں گے۔ ابارشن تو ہم اس کا کبھی نہیں کروائیں گے۔ تمہاری درندگی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت تو ہونا ہی چاہیے اس دنیا میں جو بیس پچیس سال بعد تمہارا گریبان پکڑ کر تم سے پوچھے کہ کیا تم انسان ہو؟ ناجائز بچوں کو جب لوگ نام نہیں دیتے تو وہ کیا بن جاتے ہیں یہ تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔ اور ایک بار سوچو۔ بیٹی پیدا ہوئی تو تم کیا کرو گے۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح ٹھوکریں کھاتی پھرے گی اور اگر اسے بھی تمہاری طرح کے لوگ ملنے لگے تو کیا ہوگا۔ کبھی سامنا ہونے پر کیا تم شرم سے ڈوب نہیں مرو گے۔ ایک بار اس بھیانک دل کے بغیر سوچو۔ لوگ اپنی اولاد کے لیے کیا کیا کرتے ہیں اور تم کیا کر رہے ہو۔"

وہ ربیعہ کی باتوں پر نظریں زمین پر جمائے خاموش کھڑا رہا۔ ربیعہ نے مزید

کچھ نہیں کہا اور فاطمہ کے ساتھ واپس ہاسٹل آ گئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ شادی پر تیار ہوگا؟" ہاسٹل واپسی پر فاطمہ نے ربیعہ سے پوچھا۔

"پتا نہیں' بہرحال اگر وہ شادی پر تیار نہ ہوا تو میں اس سے کہوں گی کہ وہ موبل کا ابارشن خود کروائے۔ یہ کام ہم نہیں کریں گے۔" ربیعہ کو تھکن محسوس ہو رہی تھی۔

شام کے وقت ربیعہ کا فون آیا تھا۔ وہ وارڈن کے کمرے میں فون سننے گئی اور جیسے حیرت سے جم کر رہ گئی تھی۔ فون پر اسفند حسن تھا کسی تمہید کے بغیر اس نے کہا تھا۔

"میں موبل سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔"

ربیعہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ "لیکن میں فی الحال اس شادی کا اعلان نہیں کرسکتا۔ کیونکہ میں ابھی اپنے والدین سے کوئی جھگڑا افورڈ نہیں کرسکتا۔ چند ماہ بعد میں پیپرز سے فارغ ہو جاؤں گا۔ تب میں اپنی فیملی کو شادی کے بارے میں بتا دوں گا۔ ابھی میں اس سے نکاح کر لیتا ہوں۔ میرے دوست کا ایک فلیٹ ہے' وہ چاہے تو وہاں شفٹ ہو جائے۔ آپ لوگ نکاح کی تاریخ طے کرلیں اور مجھے انفارم کر دیں۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے ربیعہ کو اپنا فون نمبر اور موبائل نمبر لکھوایا تھا۔ ربیعہ کی ساری تھکن جیسے غائب ہو گئی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی واپس کمرے میں آئی تھی اور یہ خبر سن کر فاطمہ کی بھی یہی حالت ہوئی تھی۔ اس رات وہ دونوں بڑے سکون سے سوئی تھیں کیونکہ انہیں لگ رہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

☆

ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی تھی۔ دوسرے دن جب انہوں نے موبل کے ہاسٹل جا کر اسے یہ خبر سنائی تو وہ جیسے ہتھے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔ "میں جانتی ہوں' میں تم لوگوں پر بوجھ ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے اس شخص کے سر تھوپنے کی کوشش کرو جو میری بربادی کا ذمہ دار ہے۔ تم اگر مجھ سے تنگ آ گئی ہو تو مجھ سے صاف صاف کہہ دو میں کہیں چلی جاؤں گی۔ لیکن مجھے دوبارہ پلیٹ میں رکھ کر اس شخص کے سامنے پیش کرنے کی کوشش مت کرو۔"

ربیعہ اور فاطمہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔ انہیں اس سے اتنے شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

"دیکھو مومل! تم ایموشنل (جذباتی) ہو رہی ہو۔" ربیعہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس نے ربیعہ کی بات کاٹ دی۔

"میں نہیں تم لوگ ایموشنل ہو رہے ہو۔ میں جس شخص کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس کی بیوی بن کر کیسے رہ سکتی ہوں۔ میں اس سے شادی کرنے کے بجائے جان دینا زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔ میرے دل میں اس کے لیے کتنی نفرت ہے یہ تم کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔ وہ اذیت' وہ تکلیف' وہ ذلت صرف مجھے اٹھانی پڑی تھی۔ وہ تمہارے ساتھ ہوا ہوتا تو پھر میں تم سے پوچھتی۔"

"مومل! میں جانتی ہوں' تم اس سے بہت نفرت کرتی ہو لیکن اپنے بچے کے بارے میں سوچو۔"

"ربیعہ! میں کیوں سوچوں اس کے بارے میں۔ وہ جہنم میں جائے۔ مجھے کسی بچے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں ہر قیمت پر اس سے چھٹکارا حاصل کرلوں گی' چاہے تم لوگ میری مدد کرو یا نہ کرو۔"

"مومل! تم اپنے بچے کو مار ڈالو گی؟۔"

"اس کے باپ نے بھی تو مجھے مار ڈالا تھا نا۔ کیا اس نے مجھ پر رحم کھایا تھا پھر میں اس پر رحم کیوں کروں۔ میں اپنی آستین میں ایک اور سانپ کیوں پالوں۔" اس کے پاس ربیعہ کی ہر بات کا جواب تھا۔

"اتنی دیر سے تمہاری باتیں سن رہی ہوں۔ اب تم ہماری بات سنو۔ اپنی تباہی کی ذمہ دار تم خود ہو۔" فاطمہ نے یک دم بولنا شروع کر دیا۔ مومل کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"فاطمہ! یہ تم کہہ رہی ہو؟۔"

"ہاں' یہ میں کہہ رہی ہوں۔ تم نے کیوں اپنی دوستوں کے کہنے پر اس سے لڑنا شروع کر دیا تھا۔ کیوں اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ اگر تم ایک فضول سی بات پر اس سے

جھگڑا مول نہ لیتیں تو آج اس حالت میں نہ ہوتیں۔ تمہیں اپنی ذلت اور رسوائی کا احساس ہے لیکن اسفند کے لیے کیا کہو گی۔ عزت صرف عورت کی نہیں ہوتی۔ مرد کی بھی ہوتی ہے۔ تم نے بھی اسے ذلیل کیا تھا اور تمہاری پہل نے ہی اسے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ تمہاری دوستوں نے تمہیں ایک غلط بات پر اکسایا۔ تم نے فوراً وہ کام کر ڈالا۔ ہم تمہیں سیدھا راستہ دکھا رہے ہیں۔ تمہاری سمجھ میں ہماری بات نہیں آ رہی۔ مجھے لگتا ہے۔ تمہیں ابھی بھی عقل نہیں آئی۔ تم نے اپنی غلطی سے کچھ نہیں سیکھا۔ تمہیں اپنی زندگی بچانے کا ایک موقع مل رہا ہے اور تم اس سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتیں۔ اسفند نے اگر تمہیں اغوا کر کے ذلالت کا ثبوت دیا تھا تو اپنے بچے کو مار کر تم کون سی اعلاظرفی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ فاطمہ بہت غصے میں تھی مگر مومل یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں اعلاظرف ہوں ہی نہیں تو اعلاظرفی کا مظاہرہ کہاں سے کروں۔ میں اس سے شادی تو کسی قیمت پر نہیں کروں گی' ہاں تم لوگوں کا بوجھ ختم کرنے کے لیے خود کو ختم کر لیتی ہوں۔" وہ تیزی سے کمرے کی کھڑکی کی طرف چلی گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ چھلانگ لگاتی' ربیعہ نے اسے پکڑ لیا تھا اور زوردار تھپڑ مار کر دور دھکیل دیا۔ ان دونوں کے جیسے ہوش اڑ گئے تھے۔

"تم یہ صلہ دے رہی ہو ہمیں۔ تمہاری وجہ سے ہماری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور تم ہمارے کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنا چاہتی ہو تا کہ ہمارا کیریر ختم ہو جائے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ ہم تمہارا مستقبل بچانا چاہتے ہیں اور تم ہمارا مستقبل تباہ کرنا چاہتی ہو۔"

پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کھڑکی بند کرتے ہوئے ربیعہ نے اس سے کہا تھا۔

مومل یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "آئی ایم سوری میں نے سوچا نہیں تھا کہ میری خودکشی کا نتیجہ تم لوگوں کے لیے اتنا تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ تم دونوں کے مجھ پر بے شمار احسانات ہیں اور میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ میں کل صبح دارالامان چلی جاؤں گی۔"

ربیعہ اس کی بات پر ایک بار پھر بھڑک اٹھی۔ "وہاں جا کر کون سی امان مل جائے گی تمہیں؟ وہاں تو اس سے بھی بڑے درندے ہیں' وہاں کس کس سے بچو گی۔"

"تو میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟" اس کی سسکیاں اور تیز ہو گئی تھیں۔

"مومل! تمہیں اپنی زندگی بچانے کا ایک موقع مل رہا ہے پھر اس کو کیوں گنوا رہی ہو۔ ہم تم سے یہ تو نہیں کہہ رہے کہ تم ساری عمر اس کے ساتھ بندھی رہنا۔ ہم تو وقتی طور پر اس سے شادی کا کہہ رہے ہیں کم از کم فی الحال تو یہ آدمی تمہارے تحفظ کا واحد ذریعہ ہے بعد میں تم اس سے طلاق بھی لے لو تو بھی کوئی تم پر اب کی طرح انگلی نہیں اٹھا سکے گا اور تمہارے بچے کو بھی اس کا نام ملے گا اور تم طلاق لیتے ہوئے اس کو چھوڑنا چاہو تو اس کے باپ کے پاس چھوڑ سکتی ہو۔ لیکن کم از کم فی الحال تو اپنے آپ کو اس مصیبت سے بچاؤ۔"

وہ بے بسی سے ان دونوں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"اگر تمہیں ہم سے ذرا بھی محبت ہے تو تم ہماری بات مان لو۔" فاطمہ نے بات کرتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

☆

دو دن بعد اسفند کے دوست کے فلیٹ پر اسفند کے ساتھ اس کا نکاح ہو گیا تھا۔ سارے انتظامات اسفند نے ہی کیے تھے۔ ربیعہ اور فاطمہ نکاح کے بعد شام تک اس کے پاس اسے تسلیاں دیتی رہیں۔ وہ خالی ذہن کے ساتھ ان کے چہرے دیکھتی رہی۔ شام کو وہ دونوں چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ آیا تھا۔

"یہ فلیٹ کی چابیاں ہیں۔ رات کے کھانے کے لیے کچھ چیزیں لا کر میں نے کچن میں رکھ دی ہیں۔ فلیٹ میں تقریباً ہر چیز موجود ہے۔ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو لسٹ بنا دینا۔ میں تمہیں کل لا دوں گا۔ میں اب جا رہا ہوں تم دروازہ لاک کر لو۔ میں صبح آؤں گا۔"

وہ اسے یہ ہدایت دے کر اس کا جواب سنے بغیر فلیٹ سے چلا گیا۔ اس نے فلیٹ کا دروازہ لاک کر لیا تھا۔ واپس بیڈ روم میں آ کر اس نے پہلے کی طرح گھٹنوں میں منہ چھپا لیا تھا۔ پچھلے چند ماہ ایک بار پھر اس کے دماغ کی اسکرین پر ابھرنے لگے تھے ایک ایک بات، ایک ایک چہرہ۔ ایک ایک منظر جیسے اس کے ذہن پر نقش تھا۔ "تمہیں

زندگی میں کچھ نہیں ملنا چاہیے اسفند حسن! کچھ بھی نہیں۔ میری طرح خالی ہاتھ ہو جانا چاہیے تمہیں بھی۔ میری طرح ذلت اور رسوائی ملنی چاہیے تمہیں۔ میری طرح تمہارے سارے خوابوں کو دھواں بن جانا چاہیے۔ مجھے اپنی زندگی میں نہیں لائے تم عذاب کو لائے ہو۔ میں تمہیں بتاؤں گی سب سے اوپر والی سیڑھی سے منہ کے بل گرنا کیسا لگتا ہے۔"

اسفند کے خلاف اس کے دل اور دماغ کا زہر بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ساری رات کسی آگ کی طرح بھڑکتی رہی۔

وہ دوسرے دن صبح دس بجے آیا۔ اپنی چابی سے فلیٹ کا دروازہ کھول کر وہ کھانے کے کچھ ڈبے لیے اندر آیا۔ وہ اسی کے انتظار میں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے دونوں کی نظریں ملیں پھر وہ نظریں چراتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔

"تم نے اپنے پاس اس فلیٹ کی دوسری چابی کیوں رکھی ہے؟" اس کے کچن سے باہر آتے ہی مومل نے تیز آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ حیرت سے اس نے مومل کا چہرہ دیکھا۔

"صرف اپنی سہولت کے لیے؟۔"

"لیکن میں نہیں چاہتی تمہارے پاس اس فلیٹ کی کوئی دوسری چابی ہو۔ میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی ہوں۔" مومل کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

اسفند نے اس کے چہرے سے نظر ہٹالی۔ کچھ دیر تک وہ کچھ بولنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے کہا۔

"دیکھو مومل! میں......" مومل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اپنی گندی زبان سے میرا نام مت لو۔" اسفند کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا۔

"اگر میری زبان تمہیں گندی لگتی ہے اور میں تمہیں اس قدر ناپسند تھا تو پھر تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"میں تمہیں ناپسند نہیں کرتی ہوں۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں اور یہ شادی میری مرضی سے نہیں ہوئی، مجھے مجبور کیا گیا تھا۔ ورنہ میں وہ سب کچھ نہیں بھولی ہوں جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔"

وہ عجیب سے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر اس کے چہرے سے نظر ہٹالی۔

"میں جانتا ہوں۔ تم نے وہ سب کچھ نہیں بھلایا ہوگا۔ وہ سب کچھ بھلانا اتنا آسان ہے بھی نہیں لیکن میں تم سے ایکسکیوز کرتا ......"

"مجھے تمہارے ایکسکیوز کی ضرورت نہیں ہے اور مجھ سے آئندہ بھی کبھی ایکسکیوز مت کرنا۔" مومل نے تیز آواز میں اس کی بات کاٹ دی۔

"میں مانتا ہوں۔ میں نے ایسی غلطی ......" اس نے دوبارہ اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ تمہارا سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔"

"نہیں۔ میں نے یہ سب صرف وقتی اشتعال میں آ کر کیا تھا اگر یہ سب غصے کی حالت میں نہ ہوا ہوتا تو تم تین دن وہاں رہی تھیں۔ میں دوبارہ بھی تمہارے پاس آتا لیکن میں نہیں آیا اگر میرا غصہ اس رات سے پہلے ختم ہو جاتا تو میں تمہیں اسی طرح واپس چھوڑ آتا۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں جو کسی عورت کی عزت نہ کرے لیکن میں نہیں جانتا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ میں اس رات کے بعد سے ٹھیک سے سو نہیں پایا' تم مجھے جتنا بُرا سمجھ رہی ہو۔ میرا ضمیر مجھے اس سے زیادہ بُرا سمجھ رہا ہے۔ پھر بھی میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو۔"

مومل کا دل چاہا تھا اس کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل ہو اور وہ اس کے چہرے کو اس سے مسخ کر دے۔ اب شکست خوردگی تھی۔ اس کے لہجے میں تب کیا تھا۔ اب ندامت تھی اور تب ۔تب فخر تھا۔ غرور تھا' اب سر جھکا ہوا تھا اور تب ......

"تم اب ساری زندگی بھی میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہو تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں معاف کیا جائے۔ میری دعا ہے کہ تمہاری بیٹی ہو اور اس کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ......"

اسفند نے بہت تیز آواز میں اس کا جملہ کاٹ دیا۔ "تم ایسی باتیں مت کرو۔ ایسا مت کہو۔"

"کیوں نہ کہوں۔ میں کہوں گی۔ ایک بار نہیں ہزار بار کہوں گی۔ کیا کر لو گے

تم؟ بتاؤ کیا کرو گے تم؟ بولو کیا کرو گے؟۔"

وہ یک دم چلانے لگی تھی۔ اسفند نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر سامنے پڑی ٹیبل پر فلیٹ کی چابی پھینکتے ہوئے تیزی سے فلیٹ سے چلا گیا۔

☆

اس دن کے بعد دوبارہ دونوں میں بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر روز چند منٹوں کے لیے وہاں آتا اور ضرورت کی چیزیں چھوڑ کر چلا جاتا مومل سارا دن اس فلیٹ میں بند رہتی۔ فاطمہ اور ربیعہ روزانہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے اس کے پاس آتی تھیں اور وہ وقت بجلی کی چمک کی طرح گزر جاتا پھر باقی سارا وقت وہ پنجرے میں بند جانور کی طرح بیڈ روم' بالکونی' لاؤنج اور کچن کے چکروں میں گزارتی۔ اسے اپنا گھر اور لوگ بے تحاشا یاد آتے۔ اسے یاد آتا۔ اس کے بھائی کس طرح اس کے ناز اٹھایا کرتے تھے کس طرح اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو پورا کرتے تھے۔ اور ہر یاد جیسے اس کا گلا دبانے لگتی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اسے اپنے بھتیجے' بھتیجیوں کے قہقہے یاد آتے تو اسے ان کی شرارتیں اور شوخیاں یاد آتیں اور وہ کئی کئی گھنٹے سر ہاتھوں میں پکڑے اپنے گال بھگوتی رہتی۔

"اور اس سب کا ذمہ دار یہی ایک شخص ہے۔ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔"

وہ سوچتی اور سفند کے لیے اس کے دل میں زہر بڑھتا جا رہا تھا۔

اسفند بہت دنوں تک اپنے ماں باپ سے یہ خبر نہیں چھپا سکا تھا کسی نہ کسی طرح یہ خبر اس کی فیملی تک پہنچ ہی گئی تھی۔ پہلے پہل تو اس کے والدین نے اس خبر پر دھیان نہیں دیا اور اسے صرف ایک افواہ سمجھی کیونکہ اسفند کی منگنی چند سال پہلے ہی اس کی اپنی پسند سے اس کی چچا زاد سے ہوئی تھی۔ دونوں شروع سے ہی اکٹھے پڑھتے رہے تھے اور یہ باہمی انڈر اسٹینڈنگ بعد میں محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ گریجویشن کے بعد اسفند نے نوشین کے بارے میں اپنے والدین کو آگاہ کر دیا تھا اور انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب یک دم ان عجیب قسم کی خبروں نے حسن علی کو کافی پریشان کر دیا تھا۔ انہوں نے ڈائریکٹ اسفند سے بات کرنی مناسب سمجھی۔ وہ دو بہنوں اور تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور ماں اور باپ دونوں کے کافی قریب تھا یہی وجہ تھی کہ

حسن علی نے اس معاملے پر اس سے بات کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا تھا۔ اور اس وقت انہیں شاید زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا لگا تھا جب اسفند نے ان کے استفسار پر انکار یا تردید کرنے کے بجائے اپنی شادی کا اعتراف کر لیا تھا۔ حسن علی کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا مگر جب انہیں یقین آیا تو وہ جیسے آگ بگولہ ہو گئے تھے۔

"اگر تمہیں اس طرح کا کارنامہ کرنا تھا تو تمہیں نوشین سے منگنی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"آپ نوشین سے میری منگنی ختم کر دیں۔ اس شادی کے بعد اب کسی اور رشتہ کی گنجائش نہیں رہی۔"

"تم کون ہوتے ہو یہ کہنے والے تم منگنی کہیں اور کرو شادی کہیں اور۔ لیکن اگر تم اس فیملی میں رہنا چاہتے ہو تو کل شام تک اچھی طرح سوچ لو اور اس لڑکی کو طلاق دے دو۔"

حسن علی نے چند لمحوں میں اپنا فیصلہ سنایا تھا اور اٹھ کر چلے گئے تھے۔

دوسرے دن شام کو انہوں نے پھر اسفند کو بلوایا۔ "پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟" انہوں نے اس کے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"پاپا! آپ جانتے ہیں۔ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں سر جھکائے ہوئے کہہ دیا۔ حسن علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ سامنے ٹیبل پر طلاق کے کاغذات پڑے ہیں اور ایک بلینک چیک ہے۔ پیپرز پر سائن کر دو اور چیک میں جتنی رقم چاہے بھرو اور اس لڑکی کو بھیج دو اور دوسرا راستہ ہے یہ کہ تم اس گھر سے چلے جاؤ۔"

اسفند ستے ہوئے چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"پاپا! میں دوسرا راستہ اختیار کروں گا۔" وہ کمرے سے جانے لگا۔

"اسفی! احمق مت بنو۔ ایک دفعہ پھر سوچو۔" اس کی ممی نے اسے جاتے ہوئے روکا۔

ممی! میں اپنا فیصلہ بدل نہیں سکتا۔ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تم فیصلہ نہیں بدلو گے تو مت بدلو لیکن پھر اس گھر سے کچھ بھی لے کر مت جانا۔ اسی طرح جاؤ اور جس فلیٹ میں تم نے اس لڑکی کو رکھا ہوا ہے۔ وہ میں

آج تمہارے دوست کے باپ سے خرید چکا ہوں۔ کل تک اسے خالی کر دو۔ اپنی عیاشیوں کے لیے خود روپیہ کماؤ میری کمائی تم ان لڑکیوں پر نہیں اڑا سکتے۔"

وہ چند لمحے زرد چہرے کے ساتھ باپ کو دیکھتا رہا پھر ہونٹ کاٹتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"میری آفر ابھی بھی وہیں ہے۔ تم جب چاہو اس لڑکی کو طلاق دے کر واپس آ سکتے ہو تمہیں ہر چیز مل جائے گی۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ بالکل خالی الذہنی کے عالم میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' وہ کیا کرے۔ کس کی مدد مانگے۔ اسے اپنے ماں باپ پر غصہ آیا تھا۔ یہ سب اس کے لیے خلاف توقع نہیں تھا مگر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس کی شادی کی خبر اس کے باپ تک اتنی جلدی پہنچ جائے گی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے اپنے سارے ڈاکومنٹس نکالے اور پھر اپنے گھر سے نکل آیا۔ اس نے ایک پی سی او سے راشد کو فون کیا۔

"سوری اسفند! میں نہیں جانتا۔ ڈیڈی کو کیسے پتہ چل گیا کہ میں نے فلیٹ تمہیں دے رکھا ہے اور وہاں تمہاری بیوی رہتی ہے میرا خیال ہے یہ ساری انفارمیشن حسن انکل نے ڈیڈی کو دی ہے۔ اب ڈیڈی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ایک دن کے اندر اندر تم سے یہ فلیٹ خالی کروالوں۔ میں نے ایک آدمی سے بات کی ہے۔ اس کے کچھ فلیٹس ہیں جنہیں وہ کرائے پر دیتا ہے۔ وہ لگژری فلیٹ تو نہیں ہیں لیکن بہرحال اتنے برے بھی نہیں ہیں۔ تم دونوں کے لیے کافی ہے۔ میں نے اسے تین ماہ کا کرایہ دے دیا ہے لیکن تم کسی دوسرے دوست کو اس فلیٹ کا اتا پتا نہ دینا اگر پھر کہیں حسن انکل تک بات پہنچ گئی تو وہ یہ فلیٹ بھی خالی کروانے کی کوشش کریں گے اور تمہارے لیے بہت سے مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ میں کل صبح تمہارے فلیٹ پر آؤں گا اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

اسفند نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

☆

اس شام جب وہ فلیٹ پر آیا تو کافی پریشان تھا۔ مومل اس وقت کھانا کھا رہی تھی۔ وہ بے مقصد ادھر ادھر پھرتا رہا جب اس نے کھانا ختم کرلیا تو وہ اس کے پاس آیا۔

''تم اپنی چیزیں پیک کرلو' ہم صبح یہ فلیٹ چھوڑ دیں گے۔''

مومل نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا مگر کچھ پوچھا نہیں۔

''کل ہم ایک دوسرے فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں گے۔ میں تم پر کچھ باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے والدین کو میری شادی کا پتا چل گیا ہے اور میں نے گھر چھوڑ دیا ہے یا یہ سمجھ لو کہ انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ میرے پاس اب صرف چند ہزار روپے ہیں اور وہ بہت عرصہ نہیں چلیں گے جب تک میرے پاس روپیہ تھا۔ میں نے تمہیں ہر آسائش دینے کی کوشش کی۔ اب میرے پاس روپیہ نہیں ہے اس لیے میں تمہیں پہلے کی طرح سہولیات فراہم نہیں کرسکوں گا۔ لیکن پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کسی چیز کی کمی نہ ہو بہرحال تمہیں کچھ بُرا وقت گزارنا پڑے گا۔''

وہ اپنی بات مکمل کر کے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ کسی ردعمل کے بغیر ڈائننگ ٹیبل سے برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ وہ بے دلی سے وہ سامان پیک کرنے لگا جو وہ وقتاً فوقتاً خرید کر لاتا رہا تھا۔

اگلی صبح وہ راشد کے ساتھ نیا فلیٹ دیکھنے گیا۔ دو کمروں' کچن' باتھ روم اور ٹیرس پر مشتمل وہ فلیٹ اس کے لیے کافی تھا۔ یہ فلیٹ پہلے فلیٹ کی طرح فرنشڈ نہیں تھا لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ دوپہر تک وہ اپنا تھوڑا بہت سامان نئے فلیٹ میں منتقل کر چکا تھا۔ اپنے والٹ میں موجود رقم سے اس نے ضرورت کی کچھ اور بنیادی چیزیں خریدیں پھر وہ راشد کی گاڑی میں مومل کو نئی جگہ لے آیا تھا۔ وہ خود ہی اس تھوڑے بہت سامان کو فلیٹ میں سیٹ کرتا رہا۔ مومل کسی تماشائی کی طرح اس کی سرگرمیاں دیکھتی رہی۔ اسفند کے چہرے کی سنجیدگی اور پریشانی اسے ایک عجیب سا سکون پہنچا رہی تھی۔

''اسفند حسن! اب...... اب تمہیں احساس ہوگا کہ اپنوں سے کٹ کر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کل تک جو آپ کے لیے جان دینے پر تیار تھے وہ آج آپ کو دیکھنا تک نہیں چاہتے۔''

رات کو وہ بیڈ روم میں سونے کے لیے چلی گئی اور وہ خالی ڈرائنگ روم میں اپنے خریدے ہوئے میٹرس کو بچھا کر اس پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں دور دور تک نیند نہیں تھی۔ آنکھیں کھولے وہ اندھیرے میں کمرے کی چھت دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

''تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟ اس طرح مجھے بے وقوف کیوں بنایا۔ میں ہمیشہ ہر معاملے میں تمہارے ساتھ فیئر رہی ہوں پھر تم نے اسفند! تم نے میرے ساتھ اس طرح کیوں کیا۔'' اس کے کانوں میں کسی کی سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔

دو دن پہلے نوشین نے اسے فون کیا تھا۔ شاید ممی نے اسے فون کر کے اس کے اعتراف کے بارے میں بتایا تھا۔

''تم ایسے نہیں تھے اسفند! تم تو کبھی بھی ایسے نہیں تھے۔'' وہ بلکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ہاں پہلے نہیں تھا' اب ہو گیا ہوں۔ نوشین! تم مجھے معاف کر دو اور آئندہ ...... آئندہ کبھی میرے ساتھ کوئی رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں تمہارے قابل نہیں رہا ہوں۔ تمہیں مجھ سے بہت بہتر' بہت اچھے انسان مل سکتے ہیں۔ میرے جیسا تھرڈ ریٹ اور تھرڈ کلاس شخص تمہارے لائق نہیں تھا۔'' اس نے اسے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

پھر بہت دیر تک فون کی بیل بجتی رہی لیکن اس نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ پھر وہ اس کے گھر آئی تھی لیکن وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ وہ بہت دیر تک اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتی رہی اور وہ کسی پتھر کے مجسمے کی طرح راکنگ چیئر پر جھولتا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اسے اپنا چہرہ دکھاتا۔ اس کے سامنے آتا۔ اس سے بات کرتا۔ وہ مایوس ہو کر روتی ہوئی چلی گئی تھی۔ وہ ساری رات اپنے اور نوشین کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آتا رہا۔ اس کی باتیں بار بار اس کے ذہن میں گونجتی رہیں۔

''ہر شخص کو اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ میری غلطی کا کفارہ یہ ہے کہ مجھے تم نہ ملو۔ میں ساری زندگی اس چیز کے بغیر رہوں جس سے میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔''

اس نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے سوچا۔

☆

اگلے چند دنوں میں اس نے ایک نائٹ کالج میں جاب ڈھونڈلی۔ چند ہفتے اس نے وہاں کام کیا اور پھر اس کے پیپرز شروع ہو گئے۔ وہ تین ہفتے پیپرز میں مصروف رہا۔ پیپرز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر مختلف جگہوں پر جابز ڈھونڈنی شروع کر دیں۔ اپنے دوستوں کے ذریعے سے وہ جہاں بھی جاب ڈھونڈتا' وہاں سے بہت جلد حسن علی اسے فارغ کروا دیتے۔ اس نے تنگ آ کر دوستوں کی مدد لینا چھوڑ دیا۔ ایک پارٹ ٹائم جاب اسے راشد نے دلوائی ہوئی تھی۔ ایک اکیڈمی کے ذریعے اس نے کچھ ٹیوشنز حاصل کر لیں اور رات کو وہ اسی نائٹ کالج میں پڑھاتا تھا لیکن پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھا۔ یہ سب کوئی مستقل انتظام نہیں تھا۔

اسے ہر ماہ تقریباً آٹھ دس ہزار مل جاتے تھے۔ لیکن فلیٹ کا کرایۂ بل اور دوسرے اخراجات نکال کر اس کے پاس صرف ایک دو ہزار بچتا تھا اور یہ رقم کافی نہیں تھی۔ پہلی بار اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ روپیہ کمانا کتنا مشکل کام ہے۔ اس نے بچپن اور جوانی دونوں آسائشوں میں گزاری تھی۔ جتنی رقم اب اسے کمانے کے لیے رات دس بجے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اس سے دوگنی رقم حسن علی اسے ہر ماہ جیب خرچ کے طور پر دیتے تھے پھر بھی اس کے اخراجات پورے نہ ہوتے اور وہ وقتاً فوقتاً ان سے مزید رقم لیتا رہتا تھا۔

حسن علی ایک نامور صنعت کار تھے اور چیمبر آف کامرس کا صدر ہونے کی وجہ سے ان کی بے تحاشا مصروفیات تھیں لیکن اپنے بزنس میں بے حد مصروف رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ہمیشہ بہت توجہ دی تھی اور یہی حال عنبرین حسن کا تھا۔ جو شادی سے پہلے ایک کالج میں لیکچرر تھیں لیکن شادی کے بعد انہوں نے اپنی جاب چھوڑ کر پوری توجہ بچوں پر دی تھی۔ انہوں نے کبھی بچوں پر بے جا پابندیاں نہیں لگائیں اور نہ ہی ان پر کیریئر کے انتخاب کے سلسلے میں دباؤ ڈالا۔

اسفند کے سب سے بڑے بھائی نے اپنی مرضی سے باپ کے ساتھ بزنس سنبھالنا شروع کر دیا تھا لیکن اسفند کا دوسرا بھائی میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سول

سروس میں چلا گیا تھا اور یہی کام اسفند نے کیا تھا۔ اکنامکس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے بھی باپ کے ساتھ بزنس میں ہاتھ بٹانے کی بجائے سول سروس میں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی بڑی بہنوں میں سے بھی دو ڈاکٹر تھیں اور ایک کسی بینک میں کام کرتی تھی۔

اسفند اور اس کی ایک بہن کے علاوہ باقی سب شادی شدہ تھے اور اب جیسے اسفند کا ایک قدم اسے زندگی کے سب سے بڑے بحران میں لے آیا تھا۔ وہ اپنی پوری فیملی کا چہیتا تھا لیکن اس پیار محبت نے اسے بگاڑا نہیں تھا۔ اس کی زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی اور پھر یک دم جیسے اسپیڈ بریکر آ گیا تھا۔ اس کا تھوڑا سا غصہ اسے آسمان سے زمین پر لے آیا تھا اور اب...... اب وہ کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔

مومل نے خود بھی کبھی ان حالات میں رہنے کا تصور نہیں کیا تھا اس کی فیملی مالی لحاظ سے اسفند حسن کے مقابل نہیں آ سکتی تھی لیکن وہ کوئی عام سے لوگ بھی نہیں تھے۔ اس کے دونوں بھائی انجینئر تھے اور اس کا بڑا بھائی ایل ڈی اے میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ زندگی کی ہر سہولت اسے دستیاب تھی اور اب وہ جس فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ اس میں برائے نام فرنیچر تھا۔ آسائشات تو بہت دور کی بات تھی۔

دونوں کے تعلقات میں وقت گزرنے کے ساتھ بھی کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ مومل اسفند کا کوئی کام نہیں کرتی تھی جو واحد عنایت وہ کرتی تھی' وہ یہ تھی کہ وہ کھانا تھوڑا زیادہ پکا لیا کرتی تھی اور اسفند کے لیے اتنا بھی بہت تھا۔ وہ صبح گھر سے نکلتا اور پھر رات گئے واپس آتا۔

مومل سارا دن گھر میں بند رہتی۔ اس نے آس پاس کے فلیٹ والوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ان کے گھر آئے۔ ان کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرے۔ جوں جوں ڈلیوری کے دن قریب آ رہے تھے۔ اسفند سے اس کی نفرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے یہ سوچ کر وحشت ہو رہی تھی کہ وہ اپنے بچے کو کیسے دیکھے گی۔ کیسے چھوئے گی۔ کیسے قبول کرے گی۔ بعض دفعہ اسے یہ سوچ کر گھن آنے لگتی کہ اس نے اس شخص سے شادی کرنا کیسے قبول کیا ہے جس نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ فاطمہ اور ربیعہ اب بھی اس کے پاس آتی تھیں مگر اب ان کی آمد و رفت میں

کچھ وقفہ آ گیا تھا۔ وہ دونوں ہر بار اسے ماضی بھول جانے کی تلقین کرتیں اور وہ آگ بگولا ہو جاتی۔

اس دن وہ آفس میں تھا جب ربیعہ نے اسے فون کر کے ہاسپٹل بلوایا تھا۔ اور جب ہاسپٹل پہنچا تو اسے بیٹی کی پیدائش کی اطلاع ملی تھی وہ بڑے عجیب سے احساسات سے دوچار ہوا تھا۔

''مومل کیسی ہے؟'' اس نے فاطمہ سے پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہے۔'' اسے فاطمہ کا لہجہ کچھ بجھا بجھا سا لگا پھر وہ بل ادا کرنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اور ڈاکٹر نے اسے بٹھا لیا۔

''میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ آپ کی طرف سے آپ کی مسز پر کیا بیٹے کے لیے کوئی دباؤ تھا؟۔''

اسفند نے حیرانی سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ''بالکل بھی نہیں۔ آپ کو یہ کس نے کہا ہے؟۔''

''تو پھر آپ کی مسز اس قدر رو کیوں رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو دیکھنے اور اسے فیڈ کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ ہم نے انہیں سکون آور انجکشن لگا کر سلایا ہے ورنہ ان کی حالت اس طرح رونے سے زیادہ خراب ہو جاتی۔''

وہ لیڈی ڈاکٹر کی بات پر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''اگر آپ کی طرف سے ان پر کوئی دباؤ نہیں تھا تو پھر انہیں کیا ہوا ہے؟'' ڈاکٹر الجھ گئی تھی۔

''ہوسکتا ہے۔ انہیں خود ہی بیٹے کی خواہش ہو اور اس وجہ سے بیٹی کی پیدائش پر انہیں صدمہ پہنچا ہو بہرحال میری طرف سے ان پر کوئی پریشر نہیں تھا۔''

اس نے بہانا بنا کر ڈاکٹر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر پتا نہیں مطمئن ہوئی یا نہیں لیکن اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ ڈاکٹر کے آفس سے نکل آیا۔

''اسفند! تم اپنی بیٹی کو نہیں دیکھو گے؟۔'' ربیعہ نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔

اس نے ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔ انکوبیٹر میں اس نے پہلی بار اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھا اور پھر نرس نے اس کی بیٹی کو اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

''آپ کی بیٹی بہت خوبصورت ہے۔ آپ کو دیکھ کر سوچ رہی ہوں۔ اسے تو خوبصورت ہونا ہی تھا۔'' اس نے نرس کو کہتے سنا۔ وہ بہت غور سے اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے کپکپاتے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ بہت نرمی سے اس کا ماتھا چوم کر اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ کسمسانے لگی۔

نرس نے آگے بڑھ کر اس کی بیٹی کو لے لیا۔ پھر ربیعہ اور فاطمہ کے ساتھ وہ مومل کے پاس بھی گیا۔ وہ نیند آور ادویات کے زیر اثر سو رہی تھی۔ ورنہ اسے سامنے دیکھ کر وہ پھٹ پڑتی۔ وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر واپس آ گیا تھا۔

مومل بہت زیادہ دن بچی سے نفرت نہیں کر پائی۔ تیسرے دن اس نے روتے ہوئے اسے گود میں لے لیا تھا۔ اس کے دل میں اسفند کے لیے نفرت تھی لیکن اپنی بیٹی کے لیے نفرت نہیں رہ پائی۔ ربیعہ اور فاطمہ کی طرح اسفند نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ چند دن ہاسپٹل میں رہ کر وہ گھر آ گئی تھی اور اسفند کے لیے اس کے تیور پہلے سے بھی زیادہ بگڑے ہوئے تھے۔ وہ بات بے بات اس سے الجھ پڑتی اور بعض دفعہ جب وہ زاشی کو اٹھانے لگتا تو وہ اسے ہاتھ لگانے نہ دیتی۔ اس کا رویہ اسفند کی سمجھ سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا کہ وہ خودکشی کر لے۔ وہ صرف اسے آرام و آسائش دینے کیلئے رات گئے تک کسی جانور کی طرح کام کرتا رہتا تھا اور وہ پھر بھی اسے معاف کرنے پر تیار نہیں تھی۔ وہ پھر بھی خوش نہیں تھی۔

انہیں دنوں اس کا سی ایس ایس کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا اور وہ ساتویں پوزیشن لے کر کامیاب ہوا تھا۔ ایک سال میں یہ پہلی خوش خبری تھی جو اسے ملی تھی پچھلے سال میں کی گئی ساری محنت' ساری ذلت اسے بھول گئی تھی۔ وہ بے حد پُرسکون اور مطمئن تھا اور اس اطمینان اور سکون نے مومل کے وجود میں ایک آگ بھڑکا دی تھی۔ ربیعہ اور فاطمہ نے گھر آ کر اسے مبارک باد دی تھی اور وہ طیش میں آ گئی تھی۔

"مجھے اس کی کامیابی کی کوئی خوشی نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ ناکام ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی۔"

"مومل! فضول باتیں مت کرو۔ کیا تم خوش نہیں ہو کہ اب تم بھی ایک اچھی زندگی گزار سکو گی' معاشرے میں تم لوگوں کا کوئی مقام ہو گا تمہاری بیٹی کو ساری آسائشات ملیں گی۔" ربیعہ نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا تھا۔

"بھاڑ میں جائیں یہ آسائشیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے خوش حال زندگی نہیں چاہیے۔ مجھے ان سب آسائشات سے نفرت ہے جو مجھے اس کے طفیل ملیں گی۔"

"مومل! تم سب کچھ بھول کیوں نہیں جاتیں؟" فاطمہ نے اس سے کہا تھا۔

"اگر یہ سب تمہارے ساتھ ہوتا تو کیا تم بھول جاتیں؟"

"بھولنے کی کوشش ضرور کرتی۔" فاطمہ نے نظریں چراتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"لیکن میں کبھی بھولنے کی کوشش بھی نہیں کروں گی۔ میں سب کچھ یاد رکھوں گی اور اسے بھی یاد دلاتی رہوں گی۔"

"تم اپنی زندگی جہنم بنا لو گی۔"

"کیا اب یہ زندگی جہنم نہیں ہے۔" ربیعہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ سننے' کچھ سمجھنے پر تیار ہی نہیں تھی۔

☆

"حسن انکل تم سے بات کرنا چاہتے ہیں؟" اس دن راشد نے اسفند کو آفس فون کر کے بتایا تھا۔

"کیوں؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ بس انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے رابطہ کر کے ان کا پیغام تم تک پہنچا دوں۔"

"ٹھیک ہے میں کل شام کو گھر جاؤں گا۔" اس نے راشد کو مطلع کیا تھا۔

دوسرے دن وہ شام کو چھ ماہ کے بعد گھر گیا تھا۔ سب اس سے بڑی گرم جوشی

سے ملے تھے سوائے حسن علی کے۔

"تو تم نے سی ایس ایس کوالیفائی کر لیا ہے؟" اسے دیکھتے ہی انہوں نے سگار سلگاتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"اور اب تمہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ تم میرے محتاج نہیں رہے اور میرے بغیر بھی آرام سے زندگی گزار سکتے ہو۔" ان کا لہجہ بہت سرد تھا۔ وہ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

"تم نے اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی کی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے پھر تم جاؤ۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"پاپا! میری ایک بیٹی ہے۔ کیا میں خود کو ٹھوکروں سے بچانے کے لیے اسے دھکے کھانے کے لیے چھوڑ دوں۔"

"ہاں۔ اسے بھی چھوڑ دو۔ ایسے رشتوں کی ہمارے خاندان میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی نہ ہی ایسی اولادیں قبول کی جاتی ہیں۔ تم اس کی ماں کو کچھ روپیہ دے دینا' وہ خود ہی اسے پال لے گی۔" انہوں نے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔

"نہیں۔ میں اپنی بیٹی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بات اگر صرف ضد کی ہے تو ٹھیک ہے پھر آپ کو جو کرنا ہے کر لیں لیکن میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔"

وہ تلخ لہجے میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆

پھر وہ ٹریننگ کے لیے اکیڈمی چلا گیا تھا۔ ہر ہفتہ ویک اینڈ پر وہ آتا اور زاشی کو اٹھائے رکھتا۔ مومل زاشی کے لیے اس کے اس التفات پر جیسے جھلس جاتی تھی۔ اسفند کی موجودگی میں زاشی اگر رونے لگتی تو وہ اسے بُری طرح پیٹتی۔ اسفند اسے روکنے کے بجائے خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہتا اور جب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال چکی ہوتی تو وہ روتی ہوئی زاشی کو اٹھاتا اور باہر لے جاتا۔ اور جب وہ کچھ دیر بعد اسے واپس لے کر آتا تو زاشی اپنے ہاتھوں میں کھانے پینے کی کوئی چیز پکڑے اس کی گود میں کھلکھلا رہی

ہوتی۔ اور اس کی یہ ہنسی مومل کو زہر لگتی۔

زاشی سے اس کا یہ سلوک اسفند کو دلبرداشتہ کر دیتا تھا۔ وہ جب بھی اسے مارتی تھی۔ ساتھ بلند آواز میں بولتی اور طعنے دیتی۔ اسفند جانتا تھا۔ وہ یہ سب اسے سناتی ہے ورنہ ڈیڑھ سال کی وہ بچی کیا سمجھ سکتی ہے۔ اس کی ہزار معذرتیں بھی مومل کے دل کو صاف نہیں کر سکی تھیں۔ وہ اکیڈمی واپس جانے کے بعد یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہتا کہ جب مومل اس کے سامنے زاشی کو بخشنے پر تیار نہیں ہوتی تھی تو اس کے پیچھے تو پتا نہیں وہ اس کا کیا حشر کر دیتی ہوگی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ جب ویک اینڈ پر واپس گھر آتا تو سارا وقت زاشی کو لپٹائے رکھتا۔ اسے سیر کے لیے باہر لے کر جاتا۔ اس کے لیے کھلونے لاتا۔ اس کے ساتھ کھیلتا۔ وہ جیسے ایک دن میں پورے ہفتے کی تلافی کر دینا چاہتا تھا۔

زاشی بھی مومل کے بجائے اسفند سے زیادہ مانوس ہو گئی تھی اسے باپ کا لمس زیادہ پسند تھا۔ وہ جب ویک اینڈ پر گھر آتا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگتی یوں جیسے اس نے اسفند کو پہچان لیا ہو۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا پہلا لفظ بھی پاپا ہی تھا۔ اسفند کی غیر موجودگی میں زاشی کے ساتھ مومل کا سلوک بہت اچھا ہوتا تھا۔ وہ اسے گود میں اٹھائے رکھتی اور بعض دفعہ بے اختیار ہو کر اسے چوم لیتی۔ وہ تھی ہی اتنی خوبصورت کہ اس پر بے اختیار پیار آتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے سارے نقوش لیے تھے۔ وہی تیکھی ناک' ڈارک براؤن آنکھیں' لمبی خم دار پلکیں' باریک ہونٹ اور سیاہ گھنے چمکدار بال جس میں اسفند کی طرح بعض جگہوں پر براؤن بالوں کے گچھے بھی تھے۔ وہ اسفند سے اس قدر مشابہہ تھی کہ اس کی گردن پر بھی اسی جگہ تل تھا جس جگہ اسفند کا تل تھا۔ بعض دفعہ اس کی یہ مشابہت مومل کو بہت تکلیف پہنچاتی تھی۔

☆

اسفند اب اپنے ماں باپ سے بھی ملنے جانے لگا تھا۔ مومل کو طلاق دینے کے لیے ابھی بھی اس پر دباؤ موجود تھا اور اس دباؤ کی بنیادی وجہ نوشین تھی جو کہیں اور شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنی بات پر قائم تھا وہ مومل اور زاشی کو چھوڑنے پر تیار

نہیں تھا۔ لیکن بہرحال حسن نے اپنی جائیداد سے دوسرے بچوں کی طرح اُس کا حصّہ بھی اُسے دے دیا تھا پھر ان ہی دنوں خاندان میں ہونے والی ایک تقریب میں اس کی ملاقات نوشین سے ہوئی۔ اور یہ ملاقات دونوں کو پھر ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔ اگر وہ ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہا ہوتا تو شاید وہ اتنی جلدی نوشین کی طرف مائل نہ ہوتا لیکن جس طرح کی زندگی وہ مومل کے ساتھ گزار رہا تھا اور جس طرح وہ اس کے ہاتھوں تذلیل کا نشانہ بنتا تھا۔ اس نے اسفند کو ایک بار پھر نوشین کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی سوچ میں واضح تبدیلی آ چکی تھی۔

وہ ویک اینڈ پر گھر گیا اور مومل کو بغور دیکھتا رہا۔ پہلی بار وہ اسے نوشین سے کمپیئر کر رہا تھا اور ہر چیز میں نوشین کا پلہ بھاری تھا۔ وہ مومل سے زیادہ خوبصورت' زیادہ دولت مند' زیادہ تعلیم یافتہ تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اسفند سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔ مومل کا رویہ اب بھی اس کے ساتھ ویسا ہی تھا وہ اب بھی اس کا کوئی کام نہیں کرتی تھی نہ اسے مخاطب کرتی تھی۔ وہ پہلی بار اضطراب کا شکار ہوا تھا۔

''مومل کو میری ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے۔ جتنی محبت اور توجہ وہ زاشی کو دیتی ہے۔ اتنی تو نوشین بھی دے سکتی ہے۔ اس زبردستی کے رشتے کو قائم رکھنے کا کیا فائدہ ہے۔ مجھے اسے آزاد کر دینا چاہیے۔ میں اسے اتنا روپیہ دے دوں گا کہ اسے کوئی مالی پریشانی نہیں ہوگی وہ آرام سے زندگی گزار سکتی ہے۔ اور میں...... میں نوشین کے ساتھ نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتا ہوں۔''

وہ جتنا ان سوچوں کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ وہ اسے اتنا ہی پریشان کرتیں۔ وہ اب جب بھی گھر آتا۔ ہر وقت مومل اور نوشین کا موازنہ کرتا رہتا اور پھر اس کا رویہ تبدیل ہوتا گیا تھا۔

مومل یہ جان چکی تھی کہ وہ دوبارہ اپنے والدین سے ملنے لگا ہے کیونکہ اب ایک بار پھر اس کے پاس ایک بہت مہنگی سی گاڑی تھی اور اس نے فلیٹ کو بھی فرنشڈ کروایا تھا لیکن اس کے ذہن میں یہ بات کہیں نہیں تھی کہ وہ اب اسے چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ انہیں دنوں ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد فاطمہ واپس اپنے والدین کے پاس چلی گئی

تھی کیونکہ اس کی شادی طے ہوگئی تھی۔

فاطمہ کے جانے کے بعد ربیعہ کی آمد بھی کم ہوگئی تھی کیونکہ وہ اسپیشلائزیشن کے لیے باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اس دفعہ وہ کافی دنوں بعد مومل کے پاس آئی تھی۔ اسفند بھی گھر آیا ہوا تھا۔ ربیعہ سے کچھ دیر تک بات چیت کرنے کے بعد وہ باہر چلا گیا تھا اور ربیعہ یک دم فکرمند نظر آنے لگی۔

''مومل! یہ اسفند کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے؟'' اس نے مومل سے پوچھا۔

''کیا بدلا ہے اس میں؟'' مومل نے لاپروائی سے جواب دیا۔ ربیعہ اس کی بات پر حیران ہوئی۔

''مومی! یہ تمہیں پتا ہونا چاہیے۔ تمہیں اس کی بیوی ہو کر یہ نہیں پتا کہ اس میں کیا تبدیلی آئی ہے اور میں یہاں پندرہ منٹ اس کے ساتھ بیٹھی ہوں تو مجھے پتا چل گیا ہے کہ وہ پہلے جیسا نہیں رہا۔''

''تو میں کیا کروں؟'' مومل نے ناگواری سے کہا تھا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''مومی! میں نے دو تین بار اسے کسی لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھا ہے۔ میں نہیں جانتی وہ لڑکی کون ہے لیکن اسفند کا جو رویہ اس کے ساتھ نظر آتا ہے' وہ کوئی اطمینان بخش بات نہیں ہے۔ تم اس کی بیوی ہو تمہیں اس پر چیک رکھنا چاہیے۔''

''مجھے اس پر چیک رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی ہے کہ وہ کس کے ساتھ اور کیوں پھرتا ہے۔ میری طرف سے وہ جہنم میں جائے۔''

ربیعہ اس کی بات سن کر یک دم کھڑی ہوگئی۔

''ٹھیک ہے میرا کام تمہیں متنبہ کرنا تھا' میں نے کر دیا اگر تم جانتے بوجھتے نقصان اٹھانا چاہتی ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔''

وہ خفگی کے عالم میں وہاں سے چلی آئی تھی۔ مومل پر اس کی باتوں یا خفگی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے اب بھی اسفند کے رویئے کو جانچنا شروع نہیں کیا تھا۔

اسفند پہلے ہی کی طرح فلیٹ پر آتا تھا لیکن اب وہ گھر پر اتنا دھیان نہیں دیتا

تھا۔ پہلے وہ ہر بار آنے پر اس سے پوچھتا کہ کیا گھر میں کسی چیز کی ضرورت ہے یا بغیر پوچھے ہی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے پر وہ چیز لے آتا لیکن اب وہ ایسا نہیں کرتا تھا۔ وہ بس ہر ماہ کچھ روپے بیڈ کی دراز میں رکھ دیتا۔ اب وہ گھر پر کھانا بھی نہیں کھاتا تھا۔ ہاں البتہ زاشی کے لیے اس کی محبت اور توجہ میں کمی نہیں آئی تھی۔ پھر انہیں دنوں اسے پہلی پوسٹنگ ملی اور وہ اے ایس پی کے طور پر ملتان چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مومل سے صرف اتنا کہا۔

''اب شاید میں ہر ہفتے نہ آسکوں اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو تم اس نمبر پر راشد کو کال کر لینا۔''

ربیعہ کو اس کی پوسٹنگ کی خبر ملی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر اس کے پاس آئی۔

''وہ تمہیں ساتھ لے کر کیوں نہیں گیا؟۔ اس سے کہو کہ وہ تمہیں ساتھ لے کر جائے۔ اسے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ اسے وہاں گھر ملا ہوا ہے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو ساتھ کیوں نہیں رکھ سکتا۔ تم اس سے بات کرو۔''

وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

''ربیعہ! میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتی۔ وہ خود ساتھ لے جائے تو ٹھیک ہے لیکن میں اس کی منتیں نہیں کروں گی۔'' مومل نے صاف انکار کر دیا۔

''تم بے وقوف ہو۔ اس کے لیے راہ ہموار کر رہی ہو۔ کون بیوی اس طرح شوہر کو دور بھیج دیتی ہے۔ ابھی تک اس کے پیروں میں زاشی کی محبت کی زنجیر تھی۔ اب وہ اس سے دور رہے گا تو یہ رشتہ بھی کمزور ہو جائے گا۔ تم سے تو خیر وہ پہلے ہی برگشتہ ہو چکا ہے۔ تم اس قدر احمق ہو کہ تم اس کی اس کمزوری کو بھی ختم کر رہی ہو۔''

مومل پہلی بار اس کی باتوں پر کچھ فکرمند ہوئی۔ ''تو میں کیا کروں؟''

''اب جب وہ آئے تو تم مجھے فون کر دینا۔ میں خود آ کر اس سے بات کروں گی۔''

مومل نے ربیعہ کی بات پر سر ہلا دیا۔

وہ ایک ماہ بعد آیا تھا اور مومل نے ربیعہ کو بلوا لیا تھا۔ تھوڑی دیر اس سے

دوسری باتیں کرنے کے بعد ربیعہ نے اس سے ان دونوں کو ساتھ لے جانے کی بات کی وہ یک دم چپ ہو گیا۔

''ہاں لے جاؤں گا۔ ابھی تو میں خود ایڈجسٹ نہیں ہو پایا وہاں۔ پھر ویسے بھی ملتان میں گرمی بہت ہے۔ اور زاشی ایسے موسم میں نہیں رہ سکے گی۔'' اس نے جیسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''زاشی ہر جگہ ایڈجسٹ ہو جائے گی اگر وہاں تم ہو گے۔ تم جانتے ہو' وہ تمہیں بہت مس کرتی ہے۔ تمہاری موجودگی اس کے لیے بہت اہم ہے۔''

''اچھا میں دیکھوں گا۔'' اس نے یہ کہہ کر بات بدل دی۔

ربیعہ جان گئی کہ وہ اب اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا۔

دوسری صبح اسفند واپس چلا گیا تھا اور شام کے وقت ربیعہ ایک بار پھر آئی تھی۔

''موی! میں ایک بات تم پر واضح کر دینا چاہتی ہوں' وہ تمہیں ساتھ لے جانے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ تمہیں ساتھ لے کر جائے گا۔ اور یہی بات میں تمہیں بہت عرصہ سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب بھی وقت ہے اپنا رویہ بدلو۔ شاید اس کے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ پیدا ہو جائے۔''

مومل پہلی بار اس کی باتوں کے جواب میں خاموش رہی تھی اور اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

☆

اسفند میں آنے والی تبدیلی کا صحیح اندازہ اسے تب ہوا تھا جب وہ دوسری بار آیا تھا۔ زاشی اور وہ دونوں بیڈروم میں تھے۔ اس نے زاشی کے کپڑے تبدیل کیے تھے۔ اسفند نہانے کے لیے باتھ روم میں گیا ہوا تھا۔ وہ زاشی کے لیے کچھ چاکلیٹس لایا تھا اور وہ بار بار چاکلیٹس کھانے کی ضد کر رہی تھی۔ مومل اسے چاکلیٹ نہیں دے رہی تھی کیونکہ وہ ایک بار پھر ہاتھ اور منہ گندا کر لیتی۔ وہ اسے بیڈ پر بٹھا کر چند منٹوں کے لیے کسی کام سے کچن میں گئی تھی اور جب وہ واپس آئی تو زاشی چاکلیٹ کھا رہی تھی' شاید اسفند نے اسے چاکلیٹ کھول کر تھما دیا تھا۔

مومل کو یک دم غصہ آیا اور اس نے زاشی کے ہاتھ سے چاکلیٹ لے کر دور پھینک دیا۔ اور پھر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے ایک اور تھپڑ مارتی۔ اسفند نے تیزی سے اس کا اٹھتا ہوا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''یہ تماشا کافی ہو چکا ہے۔ اب اسے ختم ہو جانا چاہیے۔'' اس کا لہجہ بہت سرد تھا۔

''میرا ہاتھ چھوڑو۔''

اس نے اس کا ہاتھ چھوڑنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگایا۔

''تم آئندہ اس پر ہاتھ نہیں اٹھاؤ گی۔''

اس نے ایک بار پھر ایک چاکلیٹ کھول کر روتی ہوئی زاشی کو تھما دیا۔

مومل غم و غصے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی پھر یک دم چیخ پڑی۔ ''تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟''

''میں اس کا باپ ہوں اور میں اب یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اب اس پر کوئی ہاتھ اٹھائے گا تو میں وہ ہاتھ توڑ دوں گا۔''

وہ اتنے تلخ لہجے میں بات کر رہا تھا کہ مومل کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے نظر ملائے بغیر بات کرتا تھا اور اب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کے مقابل کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر کمرے سے چلی گئی۔ اس رات اسے ربیعہ کی ساری باتیں یاد آئی تھیں۔

اگلے ماہ وہ گھر نہیں آیا اور پھر دو ماہ کے وقفہ کے بعد گھر آیا تھا۔ اس رات وہ حسب معمول زاشی کو اس کے پاس چھوڑ کر بیڈروم میں جانے لگی تو اس نے کہا۔

''آج تم اسے بیڈروم میں سلا دو اور اسے سلانے کے بعد یہاں آنا۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

وہ اس کے لہجے سے کچھ کھٹک گئی۔ زاشی کو سلانے میں زیادہ دیر نہیں لگی لیکن اس کے سامنے جانے کے لیے ہمت پیدا کرنے میں اسے کافی وقت لگا۔ وہ جی کڑا کر کے بیڈروم سے نکل آئی۔

اسفند نے خاموشی سے اسے آتے اور سامنے صوفے پر بیٹھتے دیکھا۔ چند لمحے

خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' ایک لمحے کے لیے مومل کا سانس رک گیا۔

''اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے دوسری شادی کی اجازت دے دو اور اگر تم مجھے دوسری شادی کی اجازت نہیں دینا چاہتیں تو پھر میں تمہیں طلاق دے دوں گا اور میرے خیال میں یہ بہتر ہے کہ تم مجھ سے طلاق لے لو۔ تمہیں مجھ سے نفرت ہے اور شاید تم حق بجانب ہو۔ میں اپنی پوری کوشش کے باوجود تمہارے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا نہیں کر سکا۔ ایسے رشتہ کو قائم رکھنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ میں نے جب تم سے شادی کی تھی تو کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ کبھی مجھے تمہیں طلاق دینا پڑے گی۔ میں اس رشتہ کو ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن تم مجھے معاف نہیں کر سکیں۔ تم اپنے دل میں اتنی وسعت پیدا نہیں کر سکیں۔ میں نے ایک چھوٹا سا گھر خرید کر تمہارے نام کر دیا ہے' یہ اس کے کاغذات ہیں۔ یہ بارہ لاکھ کا چیک ہے۔ دو لاکھ حق مہر کے ہیں اور دس لاکھ میں تمہیں اور دے رہا ہوں تاکہ تمہیں کوئی مالی پریشانی نہ ہو۔''

اس نے میز پر کچھ کاغذات رکھ دیئے۔

''جہاں تک زاشی کا تعلق ہے تو اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم اس سے محبت کرو گی اور اس پر پوری توجہ دو گی تو تم اسے اپنے پاس رکھ سکتی ہو۔ میں اس کا خرچ تمہیں بھجواتا رہوں گا۔ دوسری صورت میں' میں اسے اپنے پاس رکھ لوں گا۔ اور میرے خیال میں اس کے حق میں یہی بہتر ہے کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ مانوس ہے۔ ویسے بھی اس کی موجودگی میں شاید تمہیں اپنی زندگی دوبارہ شروع کرنے میں کچھ مسئلہ ہو۔''

''اور اگر میں طلاق نہ لوں تو؟'' مومل کو اپنی آواز کسی اندھے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

''تب بھی صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئے گی۔ بس یہ ہو گا کہ میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا لیکن میں پہلے کی طرح یہاں نہیں آؤں گا اور مجھے اپنے والدین سے یہ بات چھپانی پڑے گی کہ میں نے تمہیں طلاق نہیں دی۔ بہرحال آخری فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے تم صبح ربیعہ کو بلوا لو اور اس کے ساتھ مشورہ کر لو۔''

مومل وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ مومل کو اسفند سے نفرت تھی لیکن پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس سے علیحدگی اختیار کر کے وہ ایک بار پھر آسمان سے زمین پر آ گرے گی۔ اسے اپنی حماقتوں کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

دوسری صبح اس نے فون کر کے ربیعہ کو بلوایا۔ ربیعہ جس وقت آئی اس وقت اسفند ناشتہ کر رہا تھا اور وہ زاشی کو ناشتہ کروا رہی تھی۔ اسفند نے بڑی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا اور اسے ناشتہ کی آفر کی لیکن ربیعہ نے انکار کر دیا۔

''کیا بات ہے؟ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ کیا تم دونوں کے درمیان پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے؟'' اس نے مومل سے کچھ متفکر ہو کر پوچھا تھا۔

''نہیں' اب کوئی جھگڑا نہیں ہو گا کیونکہ میں اسے طلاق دے رہا ہوں اور دوسری شادی کر رہا ہوں۔''

ربیعہ کو اس کی بات پر جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ مومل کچھ کہے بغیر ستے ہوئے چہرے کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

''اسفند! تم یہ کیسے کر سکتے ہو؟''

''تمہیں مجھ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں بلکہ میری ہمت کی داد دینی چاہیے کہ میں نے اب تک ایسا کیوں نہیں کیا۔''

''اسفند! تم زاشی کے بارے میں سوچو' وہ ......''

''میں نے اس کا سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ یہ طلاق اس کے لیے بھی بہتر رہے گی۔''

''اسفند! کیا تم مومل کو ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دو گے؟''

''میں اسے ٹھوکریں کھانے کے لیے نہیں چھوڑ رہا۔ میں اسے ایک گھر اور بارہ لاکھ روپے دے رہا ہوں اسے اور کچھ چاہیے تو وہ بھی دے دوں گا۔''

''وہ اکیلی کیسے رہے گی؟''

''وہ رہ لے گی۔ اسے اکیلے رہنا پسند ہے۔'' اس کے پاس جیسے ربیعہ کے ہر

سوال کا جواب تھا۔

''ایسا مت کرو اسفند! اپنا گھر تباہ مت کرو۔'' ربیعہ نے لجاجت سے کہا تھا اور وہ یک دم جیسے پھٹ پڑا۔

''گھر...... کون سا گھر؟ مجھے بتاؤ ربیعہ! کون سا گھر تباہ ہو گا۔ کیا یہ گھر ہے جو تمہیں نظر آ رہا ہے؟ یہ تو صرف رہنے کا ایک ٹھکانا ہے۔ میرا گھر تو وہ تھا جو میں نے آج سے چار سال پہلے ایک حماقت کی وجہ سے کھو دیا تھا۔ اب مجھے اپنا گھر ہی تو واپس حاصل کرنا ہے۔''

''اسفند! تم......'' ربیعہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اسفند نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میری بات سنو ربیعہ! آج صرف میری بات سنو۔ تم مومل کی دوست تو نہیں تھیں۔ صرف معمولی سی جان پہچان تھی پھر بھی تم نے صرف اس لیے اس کا ساتھ دیا کیونکہ تم اسے بے قصور سمجھتی تھیں آج تم انصاف کرو اور پھر اگر مجھے قصوروار پاؤ تو میرا ساتھ نہ دینا۔ میں نے دو سال میں یونیورسٹی میں جو عزت' جو نام حاصل کیا تھا وہ اس نے تھپڑ مار کر ختم کر دیا تھا۔ مجھے تکلیف نہ ہوتی اگر وہ الزام صحیح ہوتا جو اس نے مجھ پر لگایا تھا لیکن میری کوئی غلطی نہیں تھی پھر بھی اس نے میری انسلٹ کی' دوسروں کے سامنے مجھے تماشا بنایا۔ جو کام میں نے کیا وہ غلط تھا۔ میں تب بھی کہتا تھا۔ آج بھی کہتا ہوں۔ میں اپنی اس حرکت کو کبھی صحیح نہیں کہوں گا۔ مگر وہ صرف جنون میں آ کر کیا تھا میں نے اور جب میرا غصہ ختم ہوا تو میرا پچھتاوا شروع ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تم دونوں کے کہنے پر اس سے فوراً شادی کر لی تھی۔ تب میں نے تم سے یہی کہا تھا کہ میں نے اپنے بچے کے لیے شادی کی ہے۔ میں اس کی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ میں نے اپنے بچے کے لیے نہیں بلکہ اس کی زندگی بچانے کے لیے اس سے شادی کی تھی۔ میں نے ایک جرم کیا تھا اور میں اس کا کفارہ ادا کر دینا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اس غلط حرکت کی وجہ سے اس کی پوری زندگی برباد ہو جائے۔ تب میری منگنی کو تین سال ہو چکے تھے نوشین سے بے تحاشا محبت کرنے کے باوجود میں نے اسے چھوڑ دیا'

کیا یہ آسان کام تھا؟۔ پھر میرے والدین نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں نے زندگی میں کبھی پانی کا گلاس بھی اپنے ہاتھ سے نہیں لیا تھا لیکن اس کیلئے میں تین تین جابز کرتا رہا۔ خود دھکے کھاتا اور خوار ہوتا رہا لیکن میں نے اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔

میں نے اسے ہر چیز مہیا کی' چاہے مجھے اس کے لیے کتنی ہی محنت کیوں نہ کرنی پڑی صرف اس لیے کیونکہ میں شرمندہ تھا۔ میں اپنی غلطی کی تلافی کرنا چاہتا تھا اور اس سب کے بدلے میں مجھے کیا ملا؟ ذلت' ذہنی اذیت' بے سکونی۔ ان چار سالوں میں اس نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ کبھی میری شرٹ پر بٹن تک لگانے کی زحمت نہیں کی میں کب گھر آتا تھا۔ کب جاتا تھا۔ اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

وہ معمولی باتوں پر مجھ سے جھگڑتی' زاشی کو مارتی۔ میں بے بسی سے دیکھتا رہا۔ میں نے اسے کبھی نہیں روکا۔ لیکن اب میں تھک چکا ہوں۔ میں بہت سزا کاٹ چکا ہوں۔ اب ایک نارمل زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک ایسی بیوی کی ضرورت ہے جو میرا خیال رکھے جسے میری پروا ہو جو مجھ سے محبت کرے جس کے ساتھ میں اپنی پرابلمز شیئر کر سکوں جو میری کامیابیوں پر خوش ہو جسے میری ضرورت ہو اور مومل یہ سب نہیں کر سکتی۔ میں نے نوشین سے زاشی کے بارے میں بات کی ہے وہ اسے ساتھ رکھنے پر تیار ہے اور میرے لیے اتنا کافی ہے۔''

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ ربیعہ کچھ بول نہیں سکی۔ وہ کیا کہتی یہ سب کچھ وہی تھا جس سے وہ وقتاً فوقتاً مومل کو روکتی رہی تھی۔

''مجھے تم سے اور تمہارے روپے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنی بیٹی چاہیے۔ مجھے زاشی چاہیے۔''

وہ پتا نہیں کس وقت بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کا لہجہ ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح اکھڑ تھا۔

''میں زاشی کو اسی صورت میں تمہیں دے سکتا ہوں جب تم میرے دیے ہوئے گھر میں رہو۔ تم اپنے لیے روپیہ لینا چاہتی ہو یا نہیں۔ وہ تمہاری مرضی ہے مگر میں زاشی کو تمہارے ساتھ دھکے کھانے کے لیے نہیں بھیج سکتا۔''

"میں جیسے چاہوں گی' اسے رکھوں گی' وہ میری بیٹی ہے۔"

"آج پہلی بار خیال آیا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے' اس سے پہلے تم نے کبھی یہ کیوں نہیں سوچا۔ اس سے پہلے تو تم ہمیشہ اسے مصیبت کہتی تھیں۔" وہ اس پر طنز کر رہا تھا۔

"میں تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتی۔ میں جو چاہوں گی۔ کروں گی۔"

"مومل! اگر اس طرح ضد کرو گی تو تمہیں مجھ سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

"میں تمہاری ہر چیز پر لعنت بھیجتی ہوں لیکن زاشی میری ہے۔ میں وہ تمہیں نہیں دوں گی۔"

"تم اگر اس گھر میں رہو تو......"

"میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔" وہ یک دم چلائی۔

"ٹھیک ہے پھر میں زاشی کو تمہیں نہیں دوں گا۔ میں نہیں چاہتا' وہ تمہارے ساتھ دھکے کھائے' تم اسے دے کیا سکتی ہو۔ تمہارے پاس کوئی جاب نہیں ہے اور اگر کوئی چھوٹی موٹی جاب کر بھی لو تو بھی ان دو چار ہزار سے تم کیا کرو گی۔ گھر اور دوسری چیزوں کے کرائے بھرو گی' خرچ چلاؤ گی یا زاشی پر خرچ کرو گی۔ اگلے سال وہ سکول جانا شروع کر دے گی اور تمہارے پاس ہے اتنا روپیہ کہ اسے کسی اچھے سکول میں داخل کروا سکو۔ مان لو مومل! تم اسے کچھ نہیں دے سکتیں۔ اسے میرے پاس رہنے دو۔ تم جب بھی اس سے ملنا چاہو گی۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔" مومل یک دم اٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئی۔ ربیعہ نے اس کے بہتے ہوئے آنسو دیکھ لیے تھے۔

"اسفند! میں مانتی ہوں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ذرا سوچو۔ طلاق دے کر تم اس کے ساتھ زیادتی نہیں کر رہے؟۔ ایک طلاق یافتہ لڑکی کی معاشرے میں کیا عزت ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو۔ مجھے بتاؤ۔ وہ کس طرح اکیلی رہے گی۔ تم اسے ایک موقع اور دو۔"

"نہیں ربیعہ! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں اسے دس ہزار مواقع دوں تو بھی اس کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ تم خود دیکھ لو' کیا اسے کوئی پشیمانی یا شرمندگی ہے؟ اور ویسے بھی میں نوشین سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم شادی کر لو لیکن مومل کو طلاق مت دو۔"

"ربیعہ! یہ فیصلہ تم مت کرو' تم اس سے بات کرو اگر وہ اس پر تیار ہو اور یہ بات چھپائے کہ میں نے اسے طلاق نہیں دی تو میں تمہاری بات مان لوں گا لیکن پہلے تم اس سے بات کرو۔"

وہ ربیعہ سے یہ کہہ کر چلا گیا تھا۔ ربیعہ اندر بیڈ روم میں چلی آئی اور جو اس کے دل میں آیا۔ اس نے مومل کو کہہ دیا۔ اس وقت اسے مومل پر کچھ اتنا ہی غصہ آ رہا تھا۔ اس نے اس کی ساری پیش گوئیوں کو سچ ثابت کر دیا تھا۔ مومل خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ پھر ربیعہ نے اس کے سامنے اپنی تجویز رکھ دی تھی اور یہ دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی جب وہ بلا تامل اس کی بات مان گئی۔

"میں نے تمہیں ہزار دفعہ سمجھایا تھا کہ اپنی عادتوں کو بدل ڈالو۔ ماضی کو بھول جاؤ لیکن تم نے سب کچھ گنوا کر دم لیا۔ میں تمہیں اب بھی کہتی ہوں۔ اپنا رویہ بدلو۔ اس پر توجہ دو۔ شادی تو اب اس نے کر ہی لینی ہے لیکن تم اسے یہ موقع نہ دو کہ وہ تمہیں اور زاشی کو بالکل ہی بھول جائے۔"

مومل خاموشی سے اس کی نصیحتیں سنتی رہی۔ اس کے سوا وہ اب کر بھی کیا سکتی تھی۔

اسفند پندرہ دن بعد دوبارہ آیا تھا اور اس بار اس نے پہلی بار مومل کے رویئے میں تبدیلی دیکھی۔ اس رات پہلی بار اس نے ٹیبل پر اس کے لیے کھانا لگایا تھا اور کھانے کے بعد خود ہی اسے چائے تیار کر کے دی۔ اگلی صبح پہلی بار اسے اپنے کپڑے خود پریس نہیں کرنے پڑے' وہ پہلے سے ہی باتھ روم میں لٹکے ہوئے تھے۔ اسے اس کے رویئے میں اتنی معمولی سی تبدیلی بھی بہت اچھی لگی تھی۔ اس دن واپس ملتان جانے سے پہلے وہ نوشین سے ملا تھا اور اس نے اسے اپنے فیصلے کے بارے میں خود ہی سب کچھ بتا دیا وہ اسے کسی دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ نوشین اس کی بات سن کر یک دم بگڑ گئی۔

"اسفند! میں دوسری بیوی بن کر رہنا نہیں چاہتی۔ میں شراکت میں زندگی نہیں گزار سکتی۔"

"نوشین! یہ ٹھیک ہے کہ میں اسے طلاق نہیں دوں گا لیکن میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ تم میرے پاس رہو گی' وہ یہیں لاہور میں رہے گی۔"

''اسفند! میں اس معاملے میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی۔''

اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

اسفند اسے قائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ صرف اس صورت میں شادی پر تیار تھی جب وہ مومل کو طلاق دے دیتا۔ وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔ گھر والوں کی طرف سے بھی اس پر مومل کو طلاق دینے اور نوشین سے شادی کے لیے دباؤ تھا اور وہ جیسے دوراہے پر کھڑا تھا۔

وہ اب مومل کو طلاق دینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس نے اپنے رویئے کو بڑی حد تک بدل لیا تھا۔ اب وہ بات بے بات اس سے الجھتی نہ تھی اور اس کی چھوٹی موٹی تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ اس نے اسفند کے اعتراضات کو بڑی حد تک دور کر دیا تھا۔ انہیں دنوں اس نے مومل اور زاشی کو پرانے فلیٹ سے ایک نئے فلیٹ میں شفٹ کر دیا تھا۔ اس نے زاشی کو ایک مانٹیسوری میں داخل کروایا تھا اور وہ مانٹیسوری پرانے فلیٹ سے بہت فاصلے پر تھی۔ نیا فلیٹ ایک لگژری فلیٹ تھا۔ نیا فلیٹ نہ صرف مکمل طور پر فرنشڈ تھا بلکہ اس میں کمروں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ نوشین سے اس کی ملاقاتیں ویسے ہی جاری تھیں لیکن وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی وہ مومل کی موجودگی میں اس سے شادی کرنے کو تیار نہ تھی۔ اور اسفند کے لیے اب مومل کو طلاق دینا مشکل ہو گیا تھا۔

ان ہی دنوں زاشی کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی۔ مومل نے سوچا کہ شاید موسم کی تبدیلی کی وجہ سے وہ بیمار ہو گئی ہے۔ اس لیے اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن جب اسفند گھر آیا تھا تب تک اس کی طبیعت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ وہ اسے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور وہیں پتا چلا تھا کہ اسے یرقان ہے۔ اور مرض کافی بگڑ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے فوری طور پر ایڈمٹ کر لیا۔ اسفند اس کی حالت دیکھ کر کافی پریشان تھا۔ اور اسی پریشانی میں وہ نوشین کے ساتھ روز دوپہر کا لنچ بھی بھول گیا۔ نوشین نے اس کے نہ آنے پر جب اسے فون کیا تھا تب وہ کلینک پر تھا۔ اسفند نے اسے زاشی کی حالت کے بارے میں بتایا تھا لیکن وہ پھر بھی اصرار کر رہی تھی کہ وہ لنچ کے لیے آئے۔ اس کی ضد پر اسفند کو بے اختیار غصہ آیا۔

''میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں نہیں آ سکتا پھر بھی تم ضد کر رہی ہو۔ تم کیا چاہتی ہو کہ میں اپنی بیٹی کو اس حالت میں چھوڑ کر تمہارے ساتھ لنچ کرتا پھروں۔''

نوشین اس کے لہجے پر دنگ رہ گئی تھی۔ ''تم مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو؟ کیوں چلا رہے ہو؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تمہیں اپنے لنچ کی پڑی ہے یہ احساس نہیں کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ اگر وہ تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تو کیا پھر بھی تم اسے اس طرح چھوڑ کر مجھے ہوٹل میں لنچ کرنے کے لیے بلواتیں۔''

''بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری بیٹی'' نوشین خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔

''مائنڈ یور لینگوئج۔ میں نہیں جانتا تھا۔ تم اس قدر پاگل ہو سکتی ہو۔''

''کیا پاگل پن دکھایا ہے میں نے۔ وہ صرف بیمار ہے، مری تو نہیں ہے جو تم اس طرح سوگ میں بیٹھ گئے ہو۔''

''نوشین! مجھے دوبارہ فون مت کرنا۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں نہ تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اسفند نے تلخی سے فون پٹخ دیا۔

نوشین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک ننھی سی بچی کے لیے اس طرح اس کی بے عزتی کر سکتا ہے۔ دوسری طرف اسفند بھی اس کی باتوں پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ نوشین اس سے اس طرح بات کرے گی اس کا خیال تھا کہ وہ زاشی کی خیریت دریافت کرے گی اور شاید اسے دیکھنے آ جائے لیکن اس نے رسمی طور پر بھی اس کا حال پوچھنے کی زحمت نہیں کی اور اس بات نے اسفند کے دل میں ایک گرہ سی لگا دی۔ وہ ایک بار پھر اس سے شادی کے فیصلے پر سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ مومل کا وجود زاشی کے لیے کتنا ضروری ہے۔ وہ جیسی بھی تھی بہرحال اس کی ماں تھی اور جو احساسات وہ زاشی کے لیے دل میں رکھتی تھی۔ وہ کوئی دوسری عورت نہیں رکھ سکتی تھی۔ دو دن زاشی ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہی تھی پھر ڈاکٹر نے اسے ڈسچارج کر دیا۔

وہ دونوں دن لاہور میں ہی میں رہا تھا۔ اس بیماری نے ایک بار پھر اسے زاشی

سے بہت قریب کر دیا تھا۔ وہ اس کے لیے سب کچھ تھی بیٹی' دوست' ساتھی سب کچھ۔ شروع شروع میں وہ صرف اپنی غلطی کی تلافی کے طور پر اسے زیادہ توجہ دیتا تھا لیکن بعد میں اس نے نامحسوس طور پر اسے اپنا گرویدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں وہ دوستوں سے کم ملتا تھا ماں باپ سے وہ کٹ چکا تھا۔ مومل اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ صرف زاشی تھی جو اسے دیکھ کر مسکرا دیتی۔ اس کی انگلی پکڑ کر کھیلتی اس کے چہرے کو چھوتی۔ اس کی باتوں کے جواب میں منہ سے آوازیں نکالتی۔ اسفند کو یوں لگتا' پوری دنیا میں اگر کسی کو اس کی پروا ہے تو وہ زاشی ہے۔ بعد میں ماں باپ سے میل جول اور نوشین سے ہونے والی ملاقاتوں نے بھی اس محبت کو کم نہیں کیا تھا۔

اسفند نے دوبارہ نوشین سے خود رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بہت دن تک اس کے فون کا انتظار کرتی رہی اور پھر تنگ آ کر اس نے خود ہی اسے کال کیا تھا۔ لیکن اسفند کا غصہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اسے بہت کچھ کہا تھا اور پھر آخر میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''میں ایک ایسی عورت سے شادی نہیں کر سکتا جو میری بیٹی کو پسند نہیں کرتی۔ تم میری طرف سے آزاد ہو جہاں دل چاہے شادی کر لو۔''

بہت سے فیصلے کرنا بہت مشکل لگتا ہے لیکن جب انسان وہ فیصلہ کر لیتا ہے تو سب کچھ جیسے آسان ہو جاتا ہے۔ ایک بار پہلے اس نے نوشین کو مومل کی خاطر چھوڑا تھا۔ دوسری بار اس نے اسے زاشی کی خاطر چھوڑ دیا تھا۔

☆

اس شام وہ دونوں ربیعہ کو چھوڑنے ائرپورٹ گئے تھے۔ وہ انگلینڈ چلی گئی تھی اور ائرپورٹ پر اسے سی آف کرتے وقت مومل کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ فاطمہ سے پہلے ہی اس کا رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا اور اب ربیعہ بھی چلی گئی تھی اور اس سے بھی جلد ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا۔ واپسی پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اسفند اس کی خاموشی کو محسوس کر رہا تھا۔ زاشی اس کی گود میں بیٹھی مسلسل باتیں کر رہی تھی۔

''پاپا! پتا ہے ربیعہ آنٹی نے کہا ہے کہ وہ میرے لیے انگلینڈ سے بہت سے

چاکلیٹس لائیں گی۔ اور ربز بھی اور فراکس بھی اور انہوں نے پرامس کیا ہے کہ وہ میرے لیے ایک بڑا سا پلین لے کر آئیں گی آپ والے سے بھی بڑا۔''

وہ اسفند سے ربیعہ کے وعدے ڈسکس کر رہی تھی۔ مومل خاموشی سے کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔ اسے آج ربیعہ اور فاطمہ کی ایک ایک بات ایک ایک احسان یاد آ رہا تھا۔ اور ہر یاد اسے ملول کر رہی تھی۔ اسفند اس کی کیفیات سے بے خبر نہیں تھا۔ زاشی کو گھر جاتے ہی ہوم ورک کا خیال آ گیا۔

''ماما! آپ مجھے ہوم ورک کروائیں۔''

اس سے پہلے کہ مومل کچھ کہتی اسفند بول اٹھا۔

''بیٹا! آج ہم آپ کو ہوم ورک کروا دیتے ہیں۔ آپ اپنی ماما کو سونے دیں۔''

وہ خاموشی سے اپنے بیڈروم میں چلی آئی لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ وہ تقریباً ساری رات روتی رہی تھی۔ دوسرے دن وہ صبح پانچ بجے اٹھی تھی کیونکہ اسفند کو جلدی جانا تھا۔ وہ اس وقت ناشتہ تیار کر رہی تھی جب وہ کچن میں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رات کو سوئی نہیں ہے۔

''ربیعہ کے جانے کا بہت افسوس ہو رہا ہے تمہیں؟''

وہ ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ لگا رہی تھی جب اسفند نے اسے مخاطب کیا تھا۔ مومل خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔

''مومل! وہ ہمیشہ تو تمہارے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک نہ ایک دن تو اسے واپس جانا ہی تھا۔ لیکن وہ دوبارہ بھی تو آئے گی اور اگر تم چاہو تو آئندہ چھٹیوں میں اس کے پاس انگلینڈ چلی جانا۔''

وہ بڑے نرم لہجے میں اسے چیئر اپ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بمشکل خود پر ضبط کر رہی تھی۔ اس کی بات پر یک دم ڈائننگ ٹیبل پر بازو ٹکا کر رونے لگی۔

چند لمحوں بعد اسے اپنے بالوں پر اس کے لمس کا احساس ہوا تھا۔ اور عجب بات یہ تھی کہ مومل کو یہ لمس برا نہیں لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا وہ خود بھی بے حد عجیب سے جذبات سے دوچار ہو رہا تھا۔ پھر مومل نے یک دم سر اٹھایا

دونوں کی نظریں ملیں اور مومل تیزی سے اٹھ کر کچن سے نکل گئی۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر وہ بھی فلیٹ سے چلا گیا۔ وہ ایک جذباتی لمحہ تھا جو دونوں کے درمیان کوئی آہٹ کیے بغیر گزر گیا تھا۔ مومل کو بعد میں خود پر بے تحاشا غصہ آیا تھا کہ وہ اتنی کمزور کیسے پڑ گئی کہ اس کے سامنے رونے لگی۔ اسے خود پر بہت افسوس ہوا تھا۔

☆

اس کی لاہور آمدورفت میں ایک تسلسل سا آ گیا تھا۔ وہ تقریباً ہر ویک اینڈ پر گھر ضرور آیا کرتا تھا۔ اس دن وہ زاشی کو آئس کریم کھلانے کے لیے باہر لے کر گیا ہوا تھا۔ مومل رات کا کھانا تیار کر رہی تھی جب ڈور بیل بجی۔ مومل نے دروازہ کھولا تو ایک عورت کا اجنبی چہرہ اس کے سامنے تھا۔

''تم مومل ہو؟'' بہت عجیب سے لہجے میں اس عورت نے کہا تھا۔ وہ اس عورت کی زبان سے اپنا نام سن کر قدرے حیران ہوئی۔ کالی ساڑھی میں ملبوس بالوں کا جوڑا بنائے وہ عورت ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود بے حد خوبصورت تھی۔

''ہاں میں مومل ہوں۔ آپ کون ہیں؟''

''میں اسفند کی مدر ہوں۔'' اس عورت نے بڑی رعونت سے کہا تھا۔

''آپ اندر آ جائیں۔'' وہ دروازے سے ہٹ گئی۔

''تم نہ بھی کہتیں۔ تب بھی میں اندر آ جاتی۔ یہ میرے بیٹے کا گھر ہے۔'' وہ نخوت سے کہتی ہوئی اندر آ گئی تھیں۔ مومل نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی۔

''آپ بیٹھیں۔''

''میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ تم سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔ اسفند سے علیحدگی کے بدلے میں کیا لو گی؟ بولو کیا لو گی؟ جو مانگو گی میں تمہیں دوں گی صرف اس کا پیچھا چھوڑ دو تم اس کے قابل نہیں ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ تم سے پیچھا چھڑائے۔ تم اسے چھوڑ دو۔ اور اس کے بدلے میں جو چاہتی ہو لے لو۔''

مومل نے سکون سے ان کی بات سنی۔

''آپ اسفند کی ماں ہیں میں اس رشتے سے آپ کی عزت کرتی ہوں مگر

آپ ایسی باتیں نہ کریں جن سے میرے دل میں آپ کے لیے عزت ختم ہو جائے۔''

عنبرین حسن اس کی بات پر بھڑک اٹھیں۔ ''مجھے تم جیسی عورتوں سے عزت نہیں چاہیے۔ میں نے تمہیں ایک بہت مناسب آفر کی ہے تم مجھے اس کا جواب دو۔''

''اگر میں آپ کو ایک بلینک چیک دوں اور آپ کو اپنا گھر چھوڑنے کے لیے کہوں تو آپ کیا یہ آفر قبول کریں گی؟''

اس کی بات پر عنبرین حسن آگ بگولہ ہو گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتیں فلیٹ کے ادھ کھلے دروازے کو کھول کر اسفند اندر داخل ہوا۔ وہ زاشی کی انگلی تھامے ہوئے تھا۔ اپنی ماں پر نظر پڑتے ہی وہ جیسے ہکا بکا رہ گیا۔

عنبرین حسن نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مومل سے کہا۔

''اپنا مقابلہ مجھ سے مت کرو۔ میں تمہاری طرح بدکردار' آوارہ اور مردوں پر ڈورے ڈالنے والی نہیں ہوں۔'' مومل کا چہرہ ان کی بات پر سرخ ہو گیا۔

''ممی! آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں۔'' اسفند یک دم آگے بڑھ آیا تھا۔

''کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے۔ میں تو اس کو اس کا غلیظ چہرہ دکھا رہی ہوں۔''

''ممی! کافی ہو گیا۔ اب آپ خاموش ہو جائیں۔ کیا آپ جانتی ہیں آپ جس کے بارے میں یہ سب کچھ کہہ رہی ہیں' وہ میری بیوی اور میری بیٹی کی ماں ہے۔'' اسفند نے تلخ لہجے میں ماں سے کہا تھا۔

''تمہاری بیٹی۔ کون سی بیٹی؟ یہ؟'' عنبرین حسن نے حقارت بھرے لہجے میں زاشی کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا ثبوت ہے کہ یہ تمہاری بیٹی ہے؟''

''ممی! آپ بس یہاں سے چلی جائیں۔ میں آپ کی کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔''

''یہ میرے شوہر کی کمائی کا فلیٹ ہے' تمہاری کمائی کا نہیں۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ تمہیں شرم آنی چاہیے کہ تم اپنے باپ کا روپیہ ایسی عورتوں پر لٹا رہے ہو۔ یہ اس قدر ستی ساوتری ہوتی تو اپنے ماں باپ کے گھر ہوتی۔ یہاں نہ ہوتی۔ اس نے کہا کہ یہ تمہاری بچی ہے اور تم فوراً اس پر جان چھڑکنے لگے۔ کیا دنیا میں تم سے بڑا احمق کوئی اور ہے۔ ایسی عورتوں کے ہزاروں چاہنے والے ہوتے ہیں۔ تمہارے جیسوں کی انہیں

تب ضرورت پڑتی ہے جب انہیں اپنی اولاد کو نام دینا ہوتا ہے۔ تم نے اسے اپنی اولاد مان لیا لیکن ہم لوگ نہیں مانیں گے۔ تمہاری اولاد وہی ہوگی جس کی ماں کوئی خاندانی عورت ہوگی۔ گھر سے بھاگی ہوئی اس جیسی لڑکی نہیں۔ یہ بات ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا کہ جسے تم اپنی بیٹی کہہ رہے ہو۔ اسے ہمارا خاندان کبھی قبول نہیں کرے گا۔ تم کسی باعزت خاندان میں اس کی شادی نہیں کرسکو گے۔''

وہ اسے یہ کہہ کر ایک جھٹکے سے فلیٹ کا دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔ مومل سرخ چہرے کے ساتھ ہونٹ کاٹتے ہوئے صوفہ پر بیٹھ گئی۔

اسفند مرد تھا۔ مرد کے دل میں بدگمانی ہمیشہ بجلی کی طرح آتی ہے جب تک اس کی ماں وہاں تھی' وہ مومل کا دفاع کر رہا تھا لیکن ان کے جاتے ہی وہ مومل سے بدگمان ہونے لگا تھا۔

''ممی جو کچھ کہہ رہی تھیں' وہ ناممکن تو نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے زاشی میری نہیں واقعی کسی اور کی بچی ہو اور مومل نے مجھے اندھیرے میں رکھا ہو۔'' اس کا ذہن یک دم شبہات سے بھر گیا تھا۔ زاشی اس کے پاس آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹنے لگی۔ اس نے اسے دور دھکیل دیا۔

''میرے پاس مت آؤ۔ اندر جا کر سو جاؤ۔''

زاشی تو باپ کے رویئے پر حیران تھی مگر مومل جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔ اس نے پہلی بار اسفند کو زاشی کو اس طرح جھڑکتے دیکھا تھا۔ اسفند اچانک کرسی کھینچ کر اس کے مقابل آن بیٹھا۔

''مومل! تم اپنی بیٹی کی قسم کھا کر کہو کہ وہ واقعی میری اولاد ہے؟''

بجلی گرتی تو شاید مومل کو اتنا شاک نہ لگتا جتنا اس کے اس ایک جملے سے لگا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ کچھ نہیں بول پائی اور اس کی اس خاموشی نے اسفند کے اضطراب میں اضافہ کردیا تھا۔

''تم مجھے بتاؤ' کیا زاشی میری اولاد ہے؟''

''یہ سوال تم خود سے کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ وہ کس کی اولاد ہے۔ یہ تمہارے

علاوہ اور کوئی نہیں جان سکتا۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

''مومل! میں تمہارے بارے میں سب کچھ نہیں جانتا۔ جب میں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا تو تم اپنے گھر گئی تھیں لیکن انہوں نے تمہیں نہیں رکھا۔ تمہارے بقول تم ربیعہ اور فاطمہ کے ساتھ رہی تھیں۔ لیکن میں نہیں جانتا۔ یہ بات سچ ہے یا نہیں ہوسکتا ہے تم کسی اور......''

وہ اپنے شبہات کو زبان دے رہا تھا۔ مومل نے اسے روک دیا۔

''اتنا کافی ہے۔ تمہیں اگر یہ لگتا ہے کہ زاشی تمہاری بیٹی نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔ میں اسے لے کر کل یہاں سے چلی جاؤں گی لیکن تم اپنی گندی زبان بند رکھو۔''

زاشی حیرت اور خوف کے عالم میں ان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ جھگڑے کی نوعیت تو سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس کے ماں باپ میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ مومل نے زاشی کو گود میں اٹھا لیا۔

''آؤ زاشی! تمہیں سلا دوں۔'' اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے اس نے کہا۔

''نہیں ماما! میں تو پاپا کے پاس سوؤں گی۔'' زاشی نے ضد کی تھی۔

''یہ تمہارے پاپا نہیں ہیں۔ تمہارے پاپا مر چکے ہیں۔''

وہ تلخ لہجے میں کہہ کر اسے بیڈ روم میں لے آئی۔ اسے کاٹ میں لٹانے کے بعد اس نے اپنا ایک بیگ نکالا اور اس میں اپنے کچھ کپڑے رکھ لیے۔ پھر ایک اور بیگ نکال کر وہ بیڈ روم سے نکل آئی۔ اسفند ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دوسرے بیڈ روم میں آئی اور زاشی کے کپڑے بیگ میں رکھنے لگی۔ واپس اپنے بیڈ روم میں آ کر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ ربیعہ اور فاطمہ تو اب یہاں تھیں نہیں اور ان دونوں کے علاوہ وہ کسی اور سے مدد کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں آہٹ ہو رہی تھی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں اس نے اسفند کو زاشی کے کاٹ پر جھکا ہوا دیکھا تھا۔ بیڈ کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس وقت وہاں کیا کر رہا تھا۔ وہ

دبے قدموں سے کاٹ کی طرف آئی۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس کی بھیگی ہوئی آواز اس کے کانوں میں اترتی گئی تھی۔

''تمہارا باپ دنیا کا غلیظ ترین آدمی ہے' وہ اس قابل نہیں تھا کہ تم اس کے گھر میں پیدا ہوتیں' پھر بھی پھر بھی میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں اس کے گناہوں کی سزا نہ دے۔''

وہ زاشی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے خود کلامی کر رہا تھا۔ مومل بنا آہٹ واپس پلٹ گئی۔ اسے اس طرح دیکھ کر اسے عجیب سا سکون ملا تھا۔ باقی رات وہ اطمینان سے سوئی تھی۔

اسفند شاید ساری رات نہیں سویا تھا۔ اس لیے صبح جب وہ اٹھ کر کچن میں آئی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی آ گیا تھا۔

''مجھے چائے بنا دو۔'' وہ کہتے ہوئے وہیں ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ مومل نے کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھا اور پھر چائے کا ایک کپ تیار کر کے اس کے سامنے رکھ دیا۔

''کل رات جو کچھ ہوا۔ میں اس کے لیے تم سے ایکسکیوز کرتا ہوں۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔''

مومل سرد نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ ''کیا تمہیں یقین آ گیا ہے کہ زاشی تمہاری بیٹی ہے؟''

''مومل! میں اپنے الفاظ کے لیے ایکسکیوز کر چکا ہوں۔ اب دوبارہ یہ بات مت کہنا۔ میں چاہتا ہوں۔ تم دونوں میرے ساتھ ملتان چلو۔ میں تم دونوں کو اب اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔''

مومل بے تاثر چہرے سے اسے دیکھتی رہی پھر کچن سے باہر آ گئی۔

☆

ایک ہفتہ بعد وہ ملتان شفٹ ہو گئی تھی۔ پہلی رات وہ زاشی کے ساتھ سوئی تھی مگر اگلی صبح اسفند نے اس سے کہا۔

''تم زاشی کا بیڈ روم الگ سیٹ کر دو اور تم خود میرے کمرے میں سویا کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ ملازم تمہیں الگ کمرے میں رہتے ہوئے دیکھ کر میرے یا تمہارے متعلق کوئی بات کریں۔ تم اگر الگ بیڈ روم میں رہو گی تو یہ بات ان سے چھپی نہیں رہے گی۔''

''وہ جو چاہے سوچیں اور جو چاہیں کہیں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔'' مومل نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''تمہیں مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اسفند نے کچھ عجیب سے لہجے میں اس سے کہا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

''میں تم سے خوفزدہ نہیں ہوں' اپنے ذہن سے یہ خوش فہمی نکال دو۔''

اس نے تلخ لہجے میں اس سے کہا۔ اسفند خاموش ہو گیا۔ اس کی بات مومل کو ایک چیلنج کی طرح لگی تھی۔ وہ اگلے دن اس کے کمرے میں شفٹ ہو گئی۔ پہلے کچھ دن وہ ٹھیک سے سو نہیں سکی اسے واقعی اسفند سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کا خوف ختم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اسفند ویسے بھی رات کو دیر سے گھر آتا اور آتے ہی اسٹڈی میں فائلز دیکھنے بیٹھ جاتا۔ رات کے دو بجے وہ کمرے میں آتا اور اس قدر تھکا ہوا ہوتا کہ چند منٹوں میں ہی سو جاتا تھا۔

''میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ چند ہفتے وہاں رہی تھی اور بے زار ہو گئی تھی۔ لاہور میں گھر کے کاموں میں اس کا وقت گزر جاتا تھا لیکن یہاں پر ملازم ہونے کی وجہ سے اسے سارا دن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ وہ بے مقصد سارا دن گھر میں پھرتی رہتی اور چند دنوں میں ہی اس پر ایک بار پھر ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اسے سارا دن گھر میں رہنا مشکل لگنے لگا تھا اور اس رات اس نے اسفند سے بات کر ہی لی تھی۔

''کس لیے؟'' وہ کچھ حیران ہوا تھا۔ ''میرا خیال ہے۔ تمہیں روپے کی تو کمی نہیں ہے۔''

''جاب صرف روپے کے لیے نہیں کی جاتی۔ میں خود کو مصروف رکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے تنک کر کہا۔

''مصروف رکھنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ تم کلب جوائن کر لو۔ یہ

جو اتنے فنکشنز کے کارڈز آتے ہیں' وہاں جایا کرو۔‘‘

’’نہیں۔ مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں بس جاب کرنا چاہتی ہوں۔‘‘ اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

’’میں تمہارے ساتھ بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن میں تمہیں جاب کرنے نہیں دوں گا۔‘‘ وہ سونے کے لیے بیڈ پر دراز ہو گیا۔

’’میں تم سے اجازت نہیں مانگ رہی ہوں' صرف تمہیں اطلاع دے رہی ہوں۔ مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

’’میں تمہارے کافی نازنخرے برداشت کر چکا ہوں اور نہیں کر سکتا۔ تم سے شادی کر کے میں پہلے ہی بہت سے مسائل سے دوچار ہوں۔ تم میرے لیے مزید مصیبتیں کھڑی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہیں میری اجازت کی ضرورت ہے یا نہیں لیکن اس شہر میں تم میری مرضی کے بغیر کام نہیں کر سکتیں' تم جابز ڈھونڈتی رہو گی اور میں تمہیں وہاں سے نکلواتا رہوں گا۔ اس لیے بہتر ہے' تم آرام سے گھر پر رہو۔‘‘

مومل نے ایک شاک کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔ اسفند کے لہجے سے اسے اپنی تذلیل کا احساس ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ اس سے جاب کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے دن اسی طرح گزرنے لگے تھے لیکن اب وہ پہلے کی طرح گھر پر نہیں رہتی تھی۔ اس نے اپنے لیے بہت سی سرگرمیاں تلاش کر لی تھیں۔ اسفند اور اس کے درمیان تعلقات کی نوعیت اب بھی وہی تھی۔ وہ اب بھی اسے معاف کرنے پر تیار نہیں تھی۔

☆

وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا تھا۔ زاشی اب نو سال کی ہو چکی تھی۔ اسفند نے اسے لاہور میں ایک ہاسٹل میں داخل کروایا ہوا تھا کیونکہ مختلف شہروں میں پوسٹنگ ہونے کی وجہ سے وہ بار بار اس کا سکول تبدیل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسفند پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ مومل اور گھر کے معاملے میں وہ کافی لاپروا اور سرد مہر ہو گیا تھا۔ مومل کے ساتھ اس کے رویے میں وہ پہلے جیسی نرمی نہیں رہی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح خاموشی سے اس کی باتیں نہیں سنتا تھا۔ بلکہ اسے جھڑک دیتا تھا۔

فیصل آباد میں اس کی پوسٹنگ کو ایک سال ہونے والا تھا جب اچانک اسے اسفند بہت بدلا ہوا لگنے لگا تھا۔ وہ یک دم بہت پُرسکون اور مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ مومل نے شروع میں اس تبدیلی کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی لیکن بہرحال وہ ایک عورت تھی جو پچھلے دس سال سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ ان تبدیلیوں کی وجہ کوئی عورت ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پریشان رہنے لگی تھی۔ اسفند کے معمولات میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ پہلے جب وہ کسی کام کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا تھا تو ہمیشہ اسے پہلے سے مطلع کر دیتا تھا۔ لیکن اب وہ مومل کو مطلع نہیں کیا کرتا تھا۔ ایک رات وہ گھر سے غائب تھا جب اچانک اس کے لیے آفس سے کال آ گئی تھی۔ پولیس نے کہیں ریڈ کیا تھا اور کسی اشتہاری ملزم کو پکڑ لیا تھا اور اب ایس پی صاحب کو بلایا جا رہا تھا۔

’’وہ گھر پر نہیں ہیں۔‘‘ آپریٹر نے کال مومل سے ملا دی تھی اور اس نے اسفند کے بارے میں بتا دیا تھا۔

’’پھر وہ کہاں ہیں؟‘‘

’’پتا نہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے' ہو سکتا ہے وہ پیٹرولنگ پر ہوں۔ ہم پتا کر لیتے ہیں لیکن اگر وہ گھر آ جائیں تو انہیں فوراً کمشنر آفس بھجوا دیں۔‘‘ بولنے والے نے اس سے کہا تھا۔

مومل نے فون بند کر دیا۔ پھر وقفے وقفے سے فون آتے رہے لیکن اسفند کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ صبح چار بجے کے قریب آیا تھا۔ مومل نے اسے پیغام پہنچا دیا۔ وہ فوراً واپس چلا گیا۔ جب دوپہر کو وہ واپس آیا تھا تو اس نے ایک فون نمبر ڈائری پر لکھ کر اس سے کہا تھا۔ اگر کبھی میرے لیے کوئی میسج آئے اور میں موبائل پر ریسیو نہ کروں تو اس فون نمبر پر مجھے انفارم کر دو۔‘‘

مومل کا دل چاہا تھا' وہ اس سے پوچھے کہ وہ پچھلی رات کہاں تھا۔ یہ تو اسے کنفرم ہو گیا تھا کہ وہ کسی سرکاری کام پر نہیں تھا۔ کچھ ہفتے اسی طرح سے گزر گئے۔ پھر ایک رات وہ اسی طرح گھر نہیں آیا۔ اور ڈپٹی کمشنر کے گھر سے اس کے لیے کال آئی

تھی۔ کچھ لوگوں نے ڈی سی ہاؤس پر فائرنگ کی تھی۔ مومل نے موبائل پر اسے رنگ کیا۔ لیکن شاید موبائل آف تھا۔ پھر اسے اس نمبر کا خیال آیا تھا اور اس نے اس نمبر پر رنگ کیا۔ کچھ دیر تک بیل ہوتی رہی پھر کسی عورت نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو کون بول رہا ہے؟" اس کی آواز میں غنودگی نمایاں تھی۔ یوں جیسے وہ ابھی نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ مومل کو چند لمحوں کے لیے یوں لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن رک گئی ہو۔ اس کے بدترین خدشے کی تصدیق ہو گئی تھی۔

"اسفند حسن سے بات کروائیں۔"

اس عورت کی آواز سے یک دم غنودگی کے آثار غائب ہو گئے۔ "یہ اسفند حسن کا گھر نہیں ہے۔ آپ نے غلط نمبر پر رنگ کیا ہے۔"

"میں جانتی ہوں یہ اسفند حسن کا گھر نہیں ہے مگر وہ پھر بھی یہیں ہے۔ آپ اسے بتا دیں کہ ڈی سی ہاؤس سے اسے کال کیا گیا ہے۔"

مومل نے اس عورت سے کہا۔ اس بار کچھ توقف کے بعد اس نے ریسیور پر اسفند کی آواز سنی۔ اسے اپنے اندر جوار بھاٹا سا اٹھتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے پیغام دے کر فون بند کر دیا۔ مومل دوبارہ سو نہیں پائی۔ وہ صبح نو بجے گھر آیا تھا اور اسے دیکھ کر مومل کو اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"وہ عورت کون تھی؟"

"جو بھی تھی بہرحال یہ اطمینان رکھو وہ میری بیوی نہیں تھی۔"

مومل کو اس کے جواب پر اور غصہ آیا تھا۔

"اگر وہ تمہاری بیوی نہیں ہے تو پھر تم وہاں کس......" اسفند نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "میں تم سے اس سلسلے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ تمہیں میری زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"تمہیں خود پر شرم آنی چاہیے۔ تم آج سے دس سال پہلے بھی جانور تھے آج بھی جانور۔"

"تم اپنا منہ بند رکھو۔"

اسفند نے سرخ چہرے کے ساتھ اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"تمہیں اسفند حسن تمہیں کوڑے لگنے چاہیں۔ پھانسی دے دینی چاہیے تمہیں۔"

"پچھلے دس سال سے پھانسی ہی تو دی جا رہی ہے مجھے۔" تلخ لہجے میں اس کی بات کا جواب دے کر اس نے اپنی جیکٹ اتار کر بیڈ پر اچھال دی۔

"تم ایک بیٹی کے باپ ہو۔ تمہیں اپنا نہیں تو اس کا احساس ہونا چاہیے۔"

"میں تمہارے اور زاشی کے لیے اور قربانیاں نہیں دے سکتا۔ میں تنگ آ گیا ہوں تم دونوں کی پروا کر کر کے۔ میں تنگ آ گیا ہوں اس زندگی سے۔ یہ زندگی نہیں ہے یہ عذاب ہے۔"

وہ اس کی بات پر بلند آواز سے چلایا تھا۔

"اس عذاب کا انتخاب تم نے خود کیا تھا۔"

"ہاں خود کیا تھا لیکن دس سال کسی غلطی کی تلافی کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ میں اب اپنی زندگی کو اپنے طریقے سے گزارنا چاہتا ہوں۔ اس زندگی پر میرا بھی حق ہے۔ میں اپنی پوری زندگی کو ایک ایکسکیوز بنا کر گزارنا نہیں چاہتا۔"

وہ واش روم میں چلا گیا۔ مومل ساکت کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆

سائرہ سے اسفند کی ملاقات چیمبر آف کامرس میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں ریسپشنسٹ تھی اور اس میں کوئی ایسی بات تھی جو مردوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیتی تھی۔ اسفند کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ دو چار بار اسے چیمبر آف کامرس جانا پڑا اور سائرہ کی پرسنالٹی اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ سائرہ اچھی عورت نہیں ہے اور اسفند واحد آدمی نہیں تھا جس پر وہ اپنے التفات کا اظہار کرتی تھی مگر اسفند کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے اس سے میل جول بڑھاتا گیا اور پھر آہستہ آہستہ بات کافی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ سائرہ کے گھر پر راتیں گزارنے لگا تھا۔ وہ ایک پوش علاقے میں ایک چھوٹے سے بنگلہ میں رہتی تھی اور ایک ریسپشنسٹ اس علاقے میں رہائش کس طرح افورڈ کر رہی تھی۔ یہ تقریباً سب ہی جانتے تھے لیکن پھر بھی اس کے

پاس آنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں آئی تھی۔ اسفند اس کا نیا شکار تھا بس فرق یہ تھا کہ یہ شکار سب کچھ جانتے بوجھتے اس کے جال میں پھنسا تھا۔

مومل ایک بار پھر دوراہے پر کھڑی تھی۔ ماضی ایک بار پھر اپنی بھیانک صورت میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

''مجھے اب اس شخص کے ساتھ نہیں رہنا۔''

وہ دس سال کے بعد فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ''مجھے ایک بار پھر اپنی فیملی کے پاس جانا چاہیے ان سے بات کرنی چاہیے۔ دس سال پہلے میں کمزور تھی بات نہیں کر سکتی تھی لیکن اب کر سکتی ہوں۔''

☆

اس دن وہ زاشی کو لاہور ہاسٹل چھوڑنے گئی تھی اور اسی دن وہ وہاں سے واپس فیصل آباد آنے کے بجائے اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اسے یاد تھا دس سال پہلے بھی وہ ایک بار اسی طرح اس گھر میں گئی تھی تب اس کی زندگی اور عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ دس سال بعد آج پھر وہ اسی دہلیز پر کھڑی تھی۔ تب اس گھر نے اسے پناہ نہیں دی تھی اور آج ......

لرزتے ہاتھ سے اس نے کال بیل بجائی تھی۔ اندر قدموں کی آہٹ ابھری تھی۔ پھر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ اسے کچھ بھی پہچاننے میں دیر نہیں لگی تھی۔ دروازہ کھولنے والے کا بھی یہی حال تھا۔ چند لمحوں تک ایک عجیب سی خاموشی تھی جو دونوں کے بیچ حائل رہی تھی۔

''مومل تم ...... تم کہاں چلی گئی تھیں؟'' سہیل بھائی جیسے اپنے حواس میں واپس آ گئے تھے آنسوؤں نے اس کے چہرے کو بھگونا شروع کر دیا۔

''آپ نے مجھے ڈھونڈا کیوں نہیں؟ آپ نے مجھ سے جان کیوں چھڑا لی۔ میں کیا اتنی بوجھ ہو گئی تھی آپ پر۔'' وہ جیسے چلا اٹھی تھی۔

''تمہیں اگر اپنی پسند سے شادی کرنا تھی تو تم ہم سے بات کر سکتی تھیں۔ کون سی خواہش تھی مومی! جو ہم نے تمہاری پوری نہیں کی تھی پھر کیوں اس طرح ہماری عزت مٹی میں ملا کر چلی گئیں۔''

انہوں نے اس پر دروازہ بند کیا تھا نہ اسے باہر نکالا تھا۔ وہ اس سے شکوہ کر

رہے تھے۔

''میں کیا ایسی تھی کہ اپنی مرضی سے شادی کے لیے گھر سے بھاگ جاتی۔ مجھے تو کسی اور لڑکی کی غلط فہمی میں اغوا کر لیا گیا تھا اور جب انہیں پتا چلا تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں گھر آئی تھی مگر بھابھی نے مجھے گھر سے نکال دیا۔''

مومل میں سچ بتانے کی ہمت نہیں تھی اس نے دس سال پہلے فاطمہ کا گھڑا ہوا جھوٹ بھائی کے سامنے دوہرا دیا۔ ''پھر میں اپنی دوست فاطمہ کے پاس چلی گئی کچھ عرصہ کے بعد اس نے اپنی جان پہچان کے لوگوں میں میری شادی کروا دی۔''

سہیل بھائی جیسے حیرت زدہ تھے۔

''تم یہاں آئی تھیں مگر کب؟ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔'' انہوں نے حیرانی سے کہا تھا۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھتی رہی۔

چند لمحے اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد انہوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ ''آؤ اندر آ جاؤ۔'' ان کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔ برستی آنکھوں کے ساتھ وہ اندر آ گئی تھی۔

باقی کے مرحلے اس سے بھی آسان ثابت ہوئے تھے۔ گھر میں کافی دیر جھگڑا ہوتا رہا تھا بھابھی اور بھائی کے درمیان اور پھر یک دم ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ جب بھابھیوں کو یہ پتا چلا تھا کہ اس کا شوہر کیا کرتا ہے۔ چند لمحوں میں ان کے رویئے بدل گئے تھے۔ انہوں نے اپنی غلطی کی معافی مانگ لی تھی جو مومل نے فراخ دلی سے دے دی تھی۔ اسے کبھی بھی بھائیوں یا بھابھیوں سے شکوہ نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی اس نے کبھی انہیں اپنی بربادی کا ذمہ دار سمجھا تھا۔ اسے اسفند کے علاوہ اور کوئی مجرم نظر نہیں آتا تھا۔ پھر وہ ماضی کھنگالنے کیسے بیٹھ جاتی۔ اس کے لیے تو یہ ہی بہت بڑی بات تھی کہ اس کے بھائیوں نے اسے معاف کر دیا تھا نہ صرف معاف کر دیا تھا بلکہ اس کی گھڑی ہوئی کہانی سن کر وہ شرمسار ہوئے تھے اور ایک بار پھر اس کے لیے اس گھر کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔

دس سال میں پہلی دفعہ وہ اتنا ہنسی تھی اس کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ ساری دنیا کو بتا دے کہ وہ ایک بار پھر سے دنیا میں واپس آ گئی ہے۔ اس کی جلاوطنی کا حکم واپس لے لیا گیا تھا۔ وہ رات کی فلائٹ سے واپس فیصل آباد آ گئی تھی۔ اس نے اسفند کو اپنے

بھائیوں سے ہونے والی اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

مومل کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دس سال کے بعد دوبارہ زندہ ہوگئی ہو اس کے سینے پر جو بوجھ تھا۔ وہ ہٹ چکا تھا۔ پہلی دفعہ اسے اپنا وجود اسفند کے مقابلے میں بے دست و پا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی خوشی اور مسرت کا احساس اس کے اندر جاگزیں ہوا تھا۔ اسفند کو اس کے اندر آنے والی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ورنہ شاید وہ کچھ چونکتا ضرور۔

☆

اس دن ملازم نے مومل کو کسی عورت کے آنے کی اطلاع دی تھی اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے کافی لوگ ملنے آتے رہتے تھے۔ کچھ اسفند سے کوئی کام کروانے کے لیے اور کچھ مختلف فنکشنز کے دعوت نامے لے کر۔ اس نے اس عورت کو بھی ایسا ہی کوئی ملاقاتی سمجھا تھا۔ ملازم کو اس نے اس عورت کو ڈرائینگ روم میں بٹھانے کے لیے کہا اور خود بالوں میں برش کرنے لگی۔ چند منٹوں بعد وہ ڈرائنگ روم میں چلی آئی اور ڈرائنگ روم میں اس نے جس چہرے کو دیکھا تھا اس نے صحیح معنوں میں اس کے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔ وہ ربیعہ تھی وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے گلے لگی تھی اور پھر جو اس نے رونا شروع کیا تو اسے چپ کرواتے کرواتے ربیعہ بھی رونے لگی۔ اچھی طرح آنسو بہا لینے کے بعد وہ اسے اوپر اپنے بیڈ روم میں لے آئی تھی۔ اسے اپنے بیڈ روم میں بٹھانے کے بعد وہ نیچے ملازم کو چائے کے بارے میں ہدایات دینے آئی تھی۔ جب وہ واپس گئی تو ربیعہ اسفند کے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی زاشی اور اسفند کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

''زاشی ہے نا یہ؟ دیکھو میں نے پہچان لیا۔ پہلے سے بھی زیادہ پیاری ہوگئی ہے۔''

مومل اس کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرائی۔

''کہاں ہے یہ؟''

''لاہور میں پڑھتی ہے۔ بورڈنگ میں ہے۔'' وہ ربیعہ کے پاس بیٹھ گئی۔

''اور باقی بچے کہاں ہیں؟'' مومل نے حیرانگی سے ربیعہ کا چہرہ دیکھا۔

''ربیعہ! کیا...... کیا اس کی گنجائش تھی؟''

ربیعہ جیسے شاک کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

''مومل! کیا تم اب بھی...... تم کیا چیز ہو مومل؟''

''بس ربیعہ! یہ سب چھوڑو۔ تم بتاؤ۔ پاکستان کب آئی ہو؟'' مومل نے بات کا موضوع بدل دیا۔ ربیعہ چند لمحے خاموش ہی رہی پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔

''دو سال ہوئے ہیں پاکستان میں شفٹ ہوئے۔ اب واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' مومل تاسف سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''دو سال ہو گئے ہیں تمہیں پاکستان آئے ہوئے اور تم نے ایک بار بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی اور میں چھ سال سے ہر ماہ تمہیں خط لکھتی رہی ہوں۔ ایک دو سال خط کا جواب دینے کے بعد تم نے اس تکلف کی بھی زحمت نہیں کی اور اب یہاں آنے کے بعد بھی تمہیں میری یاد نہیں آئی۔'' مومل کو صحیح معنوں میں دکھ ہوا تھا۔

''بس یار! کیا بتاؤں۔ میں کس قدر مصروف ہوگئی تھی۔ تمہیں پتا ہی ہے شادی اور اس کے بعد کی ذمہ داریاں پھر میں خود بھی جاب کرتی ہوں تو فرصت اور بھی کم ہی ملتی ہے۔ لیکن دیکھو اب جب فرصت ملی ہے تو سب سے پہلے تمہارے پاس ہی آئی ہوں۔''

''کتنے بچے ہیں تمہارے؟''

''تین بیٹیاں ہیں۔ دو کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ جڑواں ہیں اور ایک اور ہے۔''

''کیا کر رہی ہو آج کل؟'' مومل نے ملازم کے آنے پر چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

''جاب کر رہی ہوں ایک گورنمنٹ ہاسپٹل میں۔''

''تم اپنے بچوں کو ساتھ کیوں نہیں لائیں؟ میں انہیں دیکھ ہی لیتی۔''

''بس یار! ابھی وہ تینوں چھوٹی ہیں۔ اتنے لمبے سفر میں کیسے سنبھالتی۔'' مومل سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے ربیعہ نے کہا۔

''تم اپنے شوہر کو ساتھ لے آتیں پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔''

''انہیں کہاں سے لاتی۔ وہ تو انگلینڈ میں ہی ہیں۔ وہ ابھی کچھ سال وہیں

رہیں گے۔ میں تو اس لیے پاکستان آ گئی ہوں' تاکہ بچے یہاں سیٹ ہو جائیں وہاں بڑے ہوں گے تو بعد میں یہاں ایڈجسٹ ہونے میں انہیں مشکل ہو گی۔'' مومل نے اس کی بات پر سر ہلا دیا۔

''فاطمہ سے کوئی رابطہ ہے؟'' مومل نے اس سے پوچھا۔

''ہاں' وہ بھی پاکستان آ چکی ہے۔ اس کے فادر ان لا کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ اسی کے شوہر کو کاروبار سنبھالنا تھا۔ اس لیے انہیں بھی واپس آنا پڑا۔ کراچی ہوتی ہے وہ۔'' ربیعہ نے تفصیل سے اسے بتایا۔

''اور اس نے بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے لگتا ہے' تم دونوں مجھ سے ملنا چاہتی ہی نہیں تھیں۔'' مومل کی زبان پر ایک بار پھر شکوہ آیا تھا۔

''نہیں۔ ایسی بات نہیں تھی۔ جب بھی ہم دونوں ملتی تھیں۔ تمہارا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ لیکن ہم دونوں کے پاس تمہارا باقاعدہ پتا نہیں تھا۔ اس لیے ملنے کی کوشش کیا کرتے پھر مصروفیت اتنی تھی کہ ہم چاہتے ہوئے بھی تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کر سکے۔ اب جب کچھ فرصت ہوئی تو میں نے اسفند کی موجودہ پوسٹنگ کا پتا کروایا اور تمہارے پاس آ گئی۔''

ربیعہ نے جیسے وضاحت کی' گو مومل اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوئی' لیکن اس نے موضوع بدل دیا۔

''اس کے بھی تین بچے ہیں۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔''

مومل اس سے بہت سی باتیں کرتی رہی اور انہیں باتوں کے دوران اس نے ربیعہ کو بتایا کہ وہ دوبارہ اپنے بھائیوں سے ملنے لگی ہے۔ اس اطلاع پر ربیعہ نے زیادہ خوشی یا جوش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

''مجھے زیادہ خوشی ہوتی اگر تمہارے اور اسفند کے تعلقات ٹھیک ہو گئے ہوتے۔''

اس نے ایک جملے میں جیسے بات ختم کر دی تھی۔ رات کو ربیعہ کی ملاقات اسفند سے بھی ہوئی تھی۔ چھ سال پہلے جب وہ انگلینڈ گئی تھی۔ آج کا اسفند اس وقت

کے اسفند سے بالکل مختلف تھا۔ بے حد سنجیدہ' بہت کم مسکرانے والا' ہلکی آواز میں رک رک کر بات کرنے والا۔ اس کی آنکھوں کی وہ چمک مفقود تھی جو لوگوں کے دلوں کو مسحور کر لیا کرتی تھی۔ وہ تو جیسے سرتاپا پچھتاوا تھا۔

ربیعہ کو اس پر بے اختیار ترس آیا۔ لیکن بہت سے مسائل ترس کھانے سے حل نہیں ہوتے۔ وہ جان بوجھ کر اس سے زاشی کے بارے میں بات کرتی رہی اس کے چہرے پر ابھرنے والی چند مدھم مسکراہٹیں اسی ایک نام کی بدولت تھیں۔

اگلے روز وہ شام کو واپس چلی گئی تھی۔ اس نے اس بار مومل کو کوئی نصیحت' کوئی ہدایت نہیں کی تھی اور اس بات پر مومل کو کچھ حیرانگی ہوئی تھی لیکن وہ مطمئن تھی کہ ربیعہ اب پہلے کی طرح اس پر دباؤ نہیں ڈال سکتی۔

مومل اب اکثر لاہور جایا کرتی تھی۔ اپنے بھائیوں سے ملنے کے علاوہ وہ ربیعہ سے بھی ملتی رہتی تھی۔ اسفند کو بھی بہت جلد پتا چل گیا تھا کہ وہ اپنے گھر آنے جانے لگی ہے لیکن اس نے مومل سے کچھ پوچھنے یا کہنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چند بار زاشی کو بھی اپنے ساتھ اپنے بھائیوں کے گھر لے کر گئی تھی۔ لیکن زاشی وہاں جا کر زیادہ خوش نظر نہیں آئی۔ وہ کسی کے ساتھ زیادہ مکس اپ نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے مومل کے اصرار کے باوجود وہ جانے پر ناخوش ہی رہتی تھی۔

☆

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' زاشی ویک اینڈ پر گھر آئی ہوئی تھی اور رات کے کھانے کے بعد اسفند تیار ہو کر کہیں جانے لگا تھا۔ جب مومل نے ترش لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔ اسفند نے ٹی وی دیکھتی ہوئی زاشی کی طرف دیکھا۔

''مجھے کام ہے۔'' کچھ ناگواری سے اس نے مومل کو جواب دیا تھا۔

''کیا کام ہے؟''

''یہ تمہیں جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہ کیوں نہیں کہتے۔ تم اسی عورت کے پاس جا رہے ہو۔''

اس بار مومل کی آواز بہت بلند تھی۔ زاشی ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اسفند نے زاشی کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں اس سے کہا۔

''اس طرح تماشا کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی کے پاس نہیں جا رہا۔ زاشی کے سامنے اس طرح کی باتیں مت کرو۔''

''کیوں نہ کروں۔ اسے پتا چلنا چاہیے کہ اس کا باپ کیا ہے اور اس کے کرتوت کیا ہیں۔''

مومل کی آواز اور تیز ہوگئی تھی۔ اس بار اسفند بھی بھڑک اٹھا۔

''تم اپنا منہ بند کرو۔ میں تم سے کسی قسم کی بکواس سننا نہیں چاہتا۔''

''کیا چاہتی ہو تم؟ بتاؤ کیا چاہتی ہو؟ زندگی کو عذاب تو پہلے ہی بنا دیا ہے' اب باقی کیا رہ گیا ہے جسے بگاڑنا چاہتی ہو؟''

''میں نے نہیں تم نے عذاب بنایا ہے۔ اپنی نہیں میری زندگی کو۔ تمہیں کیا پریشانی ہے۔ تمہاری عیاشیاں تو اسی طرح جاری ہیں۔ تمہیں کس چیز کی کمی ہے۔''

''زاشی! اٹھو۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔''

اسفند نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے زاشی سے کہا جو حیرانی سے اس جھگڑے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگی۔ مومل نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔

''زاشی یہاں سے نہیں جائے گی۔ جو کچھ ہوگا' اس کے سامنے ہی ہوگا۔ اپنی اصلیت کیوں چھپانا چاہتے ہو اس سے۔ اپنا بھیانک چہرہ کیوں نہیں دکھانا چاہتے اسے۔'' مومل کے لہجے میں صرف زہر تھا۔

''میں تم پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا ہوں۔ بہتر ہے' تم خاموش ہو جاؤ۔''

''نہیں' میں خاموش نہیں رہوں گی۔ تمہیں جو کرنا ہے کرلو۔ مارنا چاہتے ہو مارو اور میں تمہیں شوٹ کردوں گی۔ گھٹیا آدمی۔'' مومل نے بہت زور سے چلا کر کہا تھا۔

''ماما پلیز آپ چلایا مت کریں۔ آپ پاپا سے آرام سے بات کرسکتی ہیں۔''

اس سے پہلے کہ اسفند اس کی بات کا کوئی جواب دیتا۔ زاشی نے یک دم بڑی ناگواری سے اس سے کہا تھا۔

''میں چلا رہی ہوں اور تمہارا باپ کیا کر رہا ہے۔'' اس کی بات پر مومل کا خون اور کھول اٹھا تھا۔

''پاپا ٹھیک کہتے ہیں۔ جھگڑا ہمیشہ آپ شروع کرتی ہیں آپ پاپا سے بدتمیزی کرتی ہیں۔ آپ کو تو ہمیشہ......''

''زاشی خاموش ہو جاؤ۔ میں تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتا۔ تم جاؤ یہاں سے۔'' اسفند نے اس کی بات کاٹ دی۔ زاشی کچھ روہانسی ہو کر کمرے سے نکل گئی اس بار مومل نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

''تم میری بیٹی کے دل میں میرے خلاف زہر بھر رہے ہو۔''

''یہ زہر تم خود اپنے رویے سے اس کے دل میں بھر رہی ہو۔ وہ اب چھوٹی سی بچی نہیں ہے کہ کچھ سمجھ ہی نہ سکے۔ تم ابھی بھی اس کے دل میں اپنی عزت برقرار رکھنا چاہتی ہو تو اپنے رویے کو بدلو۔''

''میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہاری بیٹی پر' اور ایسی عزت پر میں اب اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں مزید برداشت نہیں کرسکتی۔ تم جیسے غلیظ انسان کے ساتھ دس سال گزار لیے۔ کافی ہیں اب تم اس گھر میں اس عورت کو لے آؤ جس کے لیے تم پاگل ہو رہے ہو۔ تمہاری بیٹی کو بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ اس کا باپ کتنا شریف انسان ہے۔''

وہ بڑے صبر اور سکون سے اس کی باتیں سنتا رہا یوں جیسے وہ یہ سب کسی اور کے بارے میں کہہ رہی تھی۔

''جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے بھائی تمہیں کتنی دیر اپنے پاس رکھتے ہیں' دس سال بعد ملے ہیں۔ کم از کم دس دن تو رکھنا ہی چاہیے۔''

مومل اس کی بات سن کر چیخ اٹھی۔

''میرے بھائیوں کے بارے میں ایک لفظ مت کہو' وہ تم سے ہزار درجے بہتر ہیں۔''

''مانتا ہوں' وہ مجھ سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ کم از کم وہ یہ تو فیصلہ کرسکتے ہیں

کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔ تم سے جان چھڑانا انہیں بہتر لگا۔ انہوں نے جان چھڑالی۔ تم سے تعلق جوڑنا انہیں فائدہ مند لگا۔ انہوں نے جوڑلیا۔ تمہارے عظیم بھائی۔''

وہ اب باہر جانے کا ارادہ ترک کر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ کھڑی اسے گھورتی رہی۔

''مجھے طلاق چاہیے ابھی اور اسی وقت۔'' اسفند کے سکون میں کوئی کمی نہیں آئی۔

''دے دوں گا۔ تمہارا یہ شوق بھی پورا کر دوں گا لیکن ابھی نہیں' پہلے مجھے اپنی بیٹی کی کہیں شادی کر لینے دو۔ اس کے بعد میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ بس دس سال اور انتظار کرلو۔''

''دس سال؟ میں تو اس گھر میں ایک منٹ اور نہیں رہ سکتی۔ نہیں اسفند حسن! تمہیں میں اب برداشت نہیں کرسکتی۔ تم طلاق نہ دو۔ میں خود تم سے طلاق لے لوں گی۔''

وہ عجیب سی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ''میں زاشی کو تمہیں نہیں دوں گا۔''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں یہ خوش فہمی کیسے ہوئی کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ مجھے زاشی کا عذاب نہیں چاہیے۔ اسے اپنے پاس رکھو اور جو چاہے اس کے بارے میں فیصلہ کرو۔ میں دوبارہ پلٹ کر اس کے بارے میں پوچھنے تک نہیں آؤں گی۔''

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر وہ اٹھ کر ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

اگلی صبح آٹھ بجے اس نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسفند آفس کے لیے تیار ہوتے ہوئے اس کی تیاریوں کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس نے مومل سے کچھ کہا نہیں بلکہ خاموشی سے نیچے ناشتہ کرنے چلا گیا۔ وہ جس وقت اپنا بیگ اٹھا کر نیچے آئی۔ اس وقت زاشی اور اسفند ناشتہ کر رہے تھے۔

''ماما! آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' زاشی اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ اس نے سرد نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں جہنم سے نکل کر جنت میں جا رہی ہوں۔ تمہیں میں بری لگتی تھی اس لیے اب تمہارا باپ تمہارے لیے نئی ماں لائے گا جو تمہارے باپ سے کبھی بدتمیزی نہیں کرے

گی نہ اس پر کبھی چلائے گی۔'' وہ زاشی کو حیران پریشان چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

گیٹ عذرا بھابھی نے کھولا تھا اور اسے دیکھ کر حیرانی اور مسرت کا اظہار کیا۔

''بھئی مومل! یہ بیگ کس لیے لائی ہو؟'' بھابھی نے اس کے بیگ کو دیکھتے ہی کہا تھا۔ وہ جو یہ تہیہ کر کے آئی تھی کہ وہ بھابھی کو جاتے ہی سب کچھ بتا دے گی اور ان سے کہہ دے گی کہ اس نے گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ان کے سوال پر بے اختیار جھجک گئی۔

''بھابھی! اس بار میں رہنے آئی ہوں۔ میرا دل چاہتا تھا۔ آپ کے پاس کچھ دن گزارنے کو۔ اس لیے میں آ گئی۔'' اس نے جھوٹ بولا۔

''تو زاشی کو بھی لے آتیں۔''

''نہیں۔ اسفند کو اچھا نہیں لگتا زاشی کا کہیں رہنا۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے بورڈنگ میں ہی رکھا جائے۔ ویسے بھی میں تو آرام کرنے آئی ہوں۔ زاشی کے ساتھ تو پھر بہت سے کام ہوتے۔''

اس نے جھوٹ پر جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ عذرا بھابھی نے کوئی اور سوال نہیں کیا مومل نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ اسے دیکھ کر سب ہی نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بھائیوں نے کئی بار اسفند سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن مومل ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ اسفند کو اس کا اپنے بھائیوں سے ملنا پسند نہیں ہے کیونکہ اسے لگتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے مشکل وقت میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔

سہیل بھائی نے کئی بار اس سے کہا کہ وہ اسفند سے مل کر یا اس سے فون پر بات کر کے اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دیتے ہیں لیکن مومل نے ہمیشہ انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ اسفند بہت سخت ہے شاید وہ یہ بھی پسند نہ کرے اور مومل کے لاہور جانے پر بھی پابندی لگا دے۔ اس کے بھائی مجبوراً اس کی بات مان گئے تھے۔

مومل کو لاہور آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اور یہ پورا ہفتہ کوئی نہ کوئی رشتہ دار اس سے ملنے آتا رہا۔ وہ دماغ کو کتنا بھی جھٹلاتی' جانتی تھی میل ملاپ کے اس سلسلے کی وجہ ایس پی اسفند حسن تھا۔ مومل منیر نہیں۔ اسے یاد تھا وہ ان ہی لوگوں کے گھروں

میں دس سال پہلے پناہ لینے کے لیے باری باری گئی تھی اور ان میں سے ہر ایک نے مقدور بھر اس کی بے عزتی کی تھی اور آج ...... اسے یہ سوچ لرزا دیتی تھی کہ جب وہ ان سب کو بتائے گی کہ وہ اسفند حسن کو چھوڑ چکی ہے یا جب وہ اسے طلاق نامہ بھجوائے گا تو کیا ہوگا؟ کیا پچھلے رویئے پھر سے واپس آ جائیں گے۔ وہ سوچتی اور اس کا دم گھٹنے لگتا۔

اس دن وہ گھر چھوڑ دینے کے بعد پہلی بار ربیعہ کے ہاں گئی تھی۔ چھٹی کا دن تھا اور ربیعہ چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف تھی۔ مومل بھی اس کے ساتھ کام نبٹاتی رہی پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے ربیعہ کو بتا دیا کہ وہ اسفند کا گھر چھوڑ آئی ہے اور وہ اسے طلاق دینے کا بھی کہہ چکی ہے۔ ربیعہ کو اس کی بات پر جیسے کرنٹ لگا تھا۔

''تمہارے بھائیوں کو پتا ہے اس بارے میں؟'' اس نے مومل سے پوچھا۔

''نہیں۔ مگر میں انہیں جلد ہی بتا دوں گی۔''

''پھر کیا وہ تمہیں پاس رکھ لیں گے؟''

''ہاں کیوں نہیں۔ وہ مجھے ضرور رکھیں گے اور اگر نہ بھی رکھیں تو بھی مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ میں اپنے لیے خود ہی کچھ نہ کچھ کرلوں گی۔''

''دس سال اس کے ساتھ رہنے کے بعد آخر اب ایسی کیا بات ہوگئی ہے کہ تم نے اس طرح اپنا گھر اور بیٹی چھوڑ دی؟'' ربیعہ کو جیسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بس میں اب وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ ربیعہ! ان دونوں کو میری ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے کافی ہیں پھر میں وہاں کیوں رہتی۔ وہ شخص۔ وہ شخص سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے گناہ کی تلافی کر دی ہے۔ اب میرا اس پر کوئی قرض ہی نہیں رہا۔ وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔ پتا نہیں وہ کن کن عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ مجھے اس کے وجود سے گھن آتی ہے۔ اسے اپنی کسی بھی حرکت پر شرمندگی نہیں۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے سب کچھ کرتا ہے۔ میں ایسے شخص کے ساتھ کیسے رہوں۔''

''مومل! تم دس سال پہلے بھی احمق تھیں۔ آج بھی بے وقوف ہو پہلے بھی ناقابل اصلاح تھیں آج بھی ہو۔ اس شخص نے تمہارے اور زاشی کے لیے کیا نہیں کیا پھر بھی ......''

''ربیعہ! میرے اندر ایک ایسا الاؤ ہے جس میں اس کی تمام مہربانیاں اپنا کوئی نقش چھوڑے بغیر راکھ ہو جاتی ہیں۔ اس نے جو میرے ساتھ کیا تھا۔ میں کبھی وہ سب بھول سکتی ہوں نہ اسے معاف کرسکتی ہوں۔''

مومل نے ربیعہ کی بات کاٹ دی تھی۔

''اس کو معاف نہیں کرسکتیں تو اپنے آپ کو کیسے معاف کر دیا۔ تم اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کی خود ذمہ دار تھیں۔ وہ سب کچھ تمہاری غلطی سے ہوا تھا۔ تمہاری جلد بازی اور بے وقوفی سے ہوا تھا۔ تمہاری زندگی اگر برباد ہوئی تھی تو اسفند کی بھی ہوئی ہے۔ دس سال اگر تم نے جہنم میں گزارے ہیں تو اس نے بھی گزارے ہیں۔ کبھی تم نے اس کے چہرے کو دیکھا ہے۔ یہ وہ چہرہ تھا جس نے پہلی بار دیکھنے پر مجھے اور فاطمہ کو مبہوت کر دیا تھا اور اب! اب وہ کیا ہے؟ اگر اس کے عورتوں کے ساتھ تعلقات ہیں اور تمہارے بقول وہ عیش کر رہا ہے تو پھر تو اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون ہونا چاہیے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور غرور ہونا چاہیے لیکن وہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اتنی بے چینی' اتنا اضطراب نہیں دیکھا جتنا اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں خوف نہیں دیکھا اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔ وہ ہر وقت اسی عذاب میں رہتا ہوگا کہ کہیں تم زاشی کو یا کسی اور کو وہ سب نہ بتا دو۔ کہیں تمہاری کوئی بات زاشی کے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا نہ کر دے۔ یہاں کتنے مرد ایسے ہوتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے اور تم مومل! تم وہ خوش قسمت ہو جسے خدا نے ایک بار پھر سے زمین پر کھڑا ہونے کا موقع دیا لیکن پتا نہیں کیوں تمہیں پاتال اس قدر پسند ہے پتا نہیں کیوں تمہیں ......''

مومل ربیعہ کی باتیں سن کر یک دم غصے میں آ گئی۔

''بس کرو ربیعہ! بس کرو۔ وعظ اور نصیحت کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ تمہارے لیے یہ سب کچھ کہنا اس لیے آسان ہے کیونکہ یہ سب تمہارے ساتھ نہیں ہوا۔ لیکن میں اس شخص کو معاف نہیں کرسکتی۔ میں اسے دیوتا سمجھ کر عبادت کروں۔ اس کی عظمت کے گن گاؤں صرف اسے لیے کیونکہ اس نے مجھ سے شادی کر لی۔ میری بچی کو اپنا نام دے

دیا۔ لیکن میں یہ سب کیوں کروں اگر اس نے مجھ سے شادی کی تو صرف اس لیے کیونکہ مجھے اغوا اس نے کروایا تھا اگر اس نے میری بچی کو اپنا نام دیا تو صرف اس لیے کیونکہ یہ اسی کی بچی تھی۔ کسی دوسرے کی نہیں۔ اگر میرے ساتھ یہ سب کسی اور نے کیا ہوتا اور پھر اسفند مجھ سے شادی کرتا تو میں بھی اسے عظیم سمجھتی لیکن اب نہیں۔ تم چاہتی ہو۔ میں روپیہ اور آسائشیں دیکھ کر سب کچھ بھول جاتی۔ کیا یہ چیزیں کسی عورت کی عزت کا متبادل ہوسکتی ہیں کیا ان چیزوں کے بدلے ایسے جرم معاف کر دینے چاہییں۔ نہیں کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکتی۔ ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ زندگی ان چیزوں کے بغیر بھی گزاری جا سکتی ہے۔" ربیعہ یک دم اس کی بات پر بھڑک اٹھی تھی۔

"ان چیزوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ یہ تم مجھ سے پوچھو۔ فاطمہ سے پوچھو۔ ان سے پوچھو جن کے پاس یہ نہیں ہیں۔ میں تمہیں اپنے اور فاطمہ کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی لیکن اب یہ ضروری ہو گیا ہے۔ جانتی ہو میں پاکستان کس لیے آئی ہوں اس لیے نہیں کہ میری بچیاں آرام سے یہاں ایڈجسٹ ہو جائیں بلکہ اپنے شوہر سے بھاگ کر آئی ہوں۔"

مومل کو ربیعہ کی بات پر جیسے شاک لگا تھا۔

"شادی سے پہلے ہی کسی انڈین عورت سے اس کے تعلقات تھے اور یہ تعلقات شادی کے بعد بھی جاری رہے۔ مجھے جب اس عورت کا پتا چلا تب میری جڑواں بیٹیاں دو ماہ کی تھیں۔ میرے پاس اسے چھوڑنے کا کوئی راستہ نہیں تھا نہ ہی میں اسے چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس شخص نے کبھی مجھے گھر کے اخراجات کے لیے ایک روپیہ نہیں دیا بلکہ مجھے جو تنخواہ ملتی تھی وہ بھی لے جاتا تھا کیونکہ اپنی تنخواہ سے اس کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے اور میں مجبور تھی اگر اسے روپے نہ دیتی تو وہ ہنگامہ برپا کر دیتا۔ مجھ پر تشدد کرتا پھر کئی کئی دن گھر نہ آتا۔ اور میں اکیلی نہیں رہ سکتی تھی۔ تم روپے کو اس لیے اہمیت نہیں دیتیں کیونکہ تمہاری ہر ضرورت بنا مانگے پوری ہو جاتی ہے۔ مجھ سے روپے کی قدر پوچھو میں انگلینڈ میں جاب کرتی تھی لیکن میرے پاس اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے پورے روپے نہیں ہوتے تھے۔ مجھے اپنے والدین سے روپے لینے پڑتے اور جو

الاؤنس میری بیٹیوں کو گورنمنٹ کی طرف سے ملتا تھا۔ اس سے میں گھر چلاتی تھی۔ ساتھ اوور ٹائم کرتی تھی۔ وہاں سے اس لیے بھاگ آئی ہوں کہ اب بیٹیاں بڑی ہو رہی تھیں۔ ان کی ضرورتیں بڑھ رہی تھیں اور وہ شخص میری جان کو عذاب کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ یہاں کم از کم میں اتنا تو کما لیتی ہوں کہ اپنی بیٹیوں کی ضرورتیں پوری کر سکوں۔ ان کے سامنے وہ تماشے تو نہیں ہوتے جو انگلینڈ میں وہ شخص کرتا تھا لیکن جاب کرنے کی وجہ سے میں سارا دن اپنی بیٹیوں کی شکل دیکھنے کو ترستی رہتی ہوں حالانکہ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ تین اور چار سال لیکن میں کیا کروں اگر کام نہ کروں تو ان کے سکول کی فیس کہاں سے دوں گی۔ گھر کا خرچ کہاں سے چلاؤں گی۔ کل کو ان کی شادیاں کہاں سے کروں گی۔ اپنی ہزار ضرورتوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے کیونکہ روپیہ نہیں ہے۔ ذرا خود کو میرے ساتھ کمپیئر کرو اور دیکھو کون سی چیز ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ جس سکول میں زاشی پڑھتی ہے۔ میں وہاں اپنی بچیوں کو بھیجنے کا صرف خواب ہی دیکھ سکتی ہوں۔ تم نے کبھی سوچا گھر کے خرچ کے لیے روپے کہاں سے آئیں گے؟ بل کون دے گا۔ زاشی کے سکول کی فیس کے لیے کہاں سے روپے لوں گی۔ ملازموں کو تنخواہ کون دے گا۔ تمہارا خرچ کہاں سے پورا ہوگا۔ نہیں تمہیں کبھی یہ سب سوچنا نہیں پڑا۔ اس لیے کہ یہ سب ذمہ داریاں اسفند نے اپنے کندھوں پر اٹھائی ہوئی ہیں۔

ٹھیک ہے اب وہ جاب کرتا ہے یہ سب افورڈ کر سکتا ہے لیکن مومل! اس نے تب بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی جب وہ ادھر اُدھر چھوٹی موٹی ملازمتیں کر کے گھر کا خرچ چلاتا تھا حالانکہ اس نے زندگی میں کبھی اس طرح تھوڑے بہت روپے کمانے کے لیے دھکے نہیں کھائے تھے پھر بھی وہ صرف اس لیے کام کرتا رہا کیونکہ اس نے تمہیں اور زاشی کو سپورٹ کرنا تھا۔ جس طرح وہ زاشی کے ناز نخرے اٹھاتا ہے۔ اس طرح میرے شوہر نے کبھی نہیں کیا۔ اس شخص نے تو کبھی انہیں گود میں اٹھانے کی زحمت نہیں کی وہ پھر بھی میں اس آدمی سے طلاق لینا نہیں چاہتی کچھ نہ ملے کم از کم نام تو رہے کل کو بیٹیاں بیاہتے ہوئے یہ کہنا نہ پڑے کہ وہ کسی مطلقہ کی بیٹیاں ہیں۔

جانتی ہو فاطمہ کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے شوہر نے یہاں پاکستان میں بھی

کسی کے ساتھ شادی کی ہوئی تھی اور اسے اس بات کا تب پتا چلا جب اپنے سسر کی وفات کی وجہ سے انہیں پاکستان شفٹ ہونا پڑا۔ وہ شخص اسے کس طرح تنگ کرتا ہے۔ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ اس نے شوہر سے خلع کے لیے درخواست دائر کی تو وہ اس کے بچے چھین کر لندن اپنی بہن کے پاس چھوڑ آیا۔ چھ ماہ وہ بچوں کے لیے روتی پیٹتی رہی پھر مجبوراً اس نے خلع کا مقدمہ واپس لے لیا اور اب وہ شوہر کے ساتھ ہی ہے۔ وہ شخص نہ تو اس پہلی بیوی کو طلاق دینے پر تیار ہے اور نہ ہی فاطمہ کو چھوڑ رہا ہے اور فاطمہ اپنے بچوں کی وجہ سے مجبور ہے۔ وہ شخص اسے جاب کرنے بھی نہیں دیتا۔ لیکن مومل! تم دیکھو پھر بھی وہ صرف بچوں کی وجہ سے اپنی خوشی کی قربانی دے رہی ہے جیسے میں دے رہی ہوں۔ تمہیں ہم نے اسی لیے کچھ نہیں بتایا تھا کہ تم پریشان ہو گی۔ اسی لیے ہم نے تم سے ملنے کی کوشش نہیں کی مومل! یہ زندگی اسی طرح ہے یہاں رہنا بہت مشکل ہے مگر پھر بھی رہنا پڑتا ہے قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں اور فاطمہ اپنی زندگی نہیں سنوار سکتے کیونکہ یہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے لیکن تم تو خوش رہ سکتی ہو۔ تمہارے گھر کی خوشی تو تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے پھر تم اسے کیوں برباد کرنے پر تلی ہو۔ تمہارے بھائیوں اور رشتہ داروں نے تمہیں اس لیے قبول کر لیا کہ تم ایک ایس پی کی بیوی ہو اگر ایک معمولی مزدور کی بیوی ہوتیں تو وہ کبھی تمہاری سنائی ہوئی کہانی پر یقین کرتے نہ تمہارے ساتھ میل جول رکھتے۔ جس شخص کے ساتھ تم دس سال سے رہ رہی ہو اسے معاف کر دو وہ اپنے اس گناہ کی سزا کاٹ چکا ہے۔ پچھلے دس سالوں نے اسے کیا دیا ہے۔ تم نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی۔ تمہیں کھونے کی اذیت اٹھانا نہیں پڑی۔ اس نے محبت بھی کی تھی اور اسے کھویا بھی۔ کیا اس سے زیادہ تکلیف دہ بات کوئی ہو سکتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا جائے لیکن اس شخص نے ایسا کیا۔ مومل! دس سال تم نے جلتے ہوئے گزارے ہیں۔ اب اس آگ کو بجھ جانے دو' یہ دوسروں کو جتنا جلائے گی جلائے گی لیکن تمہارے وجود کو تو یہ راکھ کر دے گی۔ اب کوئی غلطی مت کرنا اب شاید پہلے کی طرح تمہیں کوئی موقع نہ ملے۔"

مومل نے پہلی بار ربیعہ کو روتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ ساکت تھی کسی مجسمے

کی طرح۔ وہ سوچتی تھی فاطمہ اور ربیعہ بہت خوش ہیں بہت اچھی زندگی گزار رہی ہیں مگر وہ تو......

ربیعہ کے گالوں پر بہنے والے آنسو مومل کے وجود کو مضمحل کر رہے تھے۔ اس کے اعصاب جیسے شل سے ہوتے جا رہے تھے۔ ایک عجیب سی تھکن تھی جو اس کے وجود کا گھیراؤ کر رہی تھی۔ وہ ربیعہ کے گھر سے اسی عالم میں کچھ کہے بغیر آئی تھی۔ ربیعہ نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ گھر آ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے بھابھی سے کہہ دیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں' وہ سونا چاہتی ہے اس لیے اسے کھانے کے لیے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ کمرے لاک کر کے وہ جا کر بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔

ربیعہ نے ٹھیک کہا تھا۔ اسفند نے اسے کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ اس نے اسے اور زاشی کو ہمیشہ سب سے اچھی چیز ہی دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پچھلے دس سال میں ہمیشہ وہ کام کیا تھا جو اسفند کو ناپسند تھا۔ جس سے وہ روکتا تھا۔ بہت دفعہ اس نے اپنی زبان کے نشتر چلائے تھے ہر بار اسفند نے بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہر بار وہی خاموش رہتا تھا۔ اسے یاد آیا تھا ایک بار اس نے اسفند سے لڑتے ہوئے زاشی کے سامنے اسے ناجائز اولاد کہا تھا اور بعد میں اس نے کس طرح مومل کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس سے اپنے کیے کی معافی مانگی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ زاشی کے سامنے دوبارہ کبھی ایسی بات نہ کہے۔ کوئی چیز اس کے گالوں کو بھگونے لگی تھی۔

وہ جانتی تھی۔ اسفند نے اچھی تعلیم کے لیے نہیں اس کے طعنوں' اس کی باتوں سے بچانے کے لیے زاشی کو بورڈنگ داخل کروا دیا تھا اور پھر کئی دنوں تک وہ گم صم رہا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اسفند زاشی کے بغیر نہیں رہ سکتا نہ وہ باپ کے بغیر رہ سکتی تھی پھر بھی اس نے اسفند کو زاشی کو بورڈنگ میں داخل کروانے سے منع نہیں کیا تھا۔ اسے جب غصہ آتا تھا وہ جو دل میں آتا اسفند اور زاشی کو کہہ دیتی اس نے کبھی پروا نہیں کی کہ زاشی اس کی باتوں سے کیا سمجھ رہی ہو گی۔ اس کے سامنے زاشی کا چہرہ آ گیا تھا۔ اسے کبھی خبر نہیں ہوتی تھی کہ زاشی کے پاس کس چیز کی کمی ہے یا اسے کس چیز کی ضرورت ہے۔

یہ سب کچھ اسفند ہی دیکھتا تھا۔ وہی زاشی کے لیے شاپنگ کیا کرتا تھا۔ وہی

اس کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا اور وہ ...... وہ کیا کرتی تھی ہاں وہ کبھی کبھار اسے ہوم ورک کروایا کرتی تھی لیکن صرف ہوم ورک کروا دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ کیا اولاد کو ماں سے صرف اسی ایک چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کچھ ہوا اس میں زاشی کا قصور نہیں تھا پھر میں نے اسے کیوں ......

آج وہ پہلی بار اپنا محاسبہ کر رہی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ وہ کیسی ماں تھی۔ کیسی بیوی تھی جس نے دس سال سے اپنی بیٹی اور شوہر کو سزا دے رکھی تھی۔ اسے اسفند سے نفرت تھی تو پھر اسے یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اس کی دی ہوئی چیزوں کا فائدہ اٹھائے۔ اپنے آرام کے لیے اس کا روپیہ استعمال کرے۔ اس کے گھر میں رہے اس کا کھائے اس کا پہنے اور پھر بھی نفرت کا ڈھول بجاتی رہے۔ ربیعہ نے اس سے کہا تھا۔

”تم اسفند کے گناہ کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔ اللہ کو فیصلہ کرنے دو اس کی سزا کا۔ تم خود اپنی اور اس کی زندگی کو عذاب مت بناؤ۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی پھر گھٹنوں میں منہ چھپائے وہ بلند آواز سے رونے لگی۔ آنسو کمال کی چیز ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں بہت شفاف نظر آتے ہیں حالانکہ پتا نہیں کتنا میل، کتنا کھوٹ، کتنا پچھتاوا یہ اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہے ہوتے ہیں۔

☆

”چائے لگا دو۔ میں تھوڑی دیر میں پیوں گا۔“

وہ ملازم کو ہدایات دیتے ہوئے اوپر کمرے میں آ گیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے لائٹ آن کی اور پھر وہ جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ صوفہ کے ایک کونے میں وہ پاؤں اوپر کیے، بازو ٹانگوں کے گرد لپیٹے، سر گھٹنوں میں چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ آہٹ کی آواز پر بھی اس کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آ گیا۔ بیڈ پر بیٹھ کر اس نے اپنے جوتے اتارنے شروع کر دیئے۔

مومل نے سر اٹھایا تھا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ دس سال پہلے اور آج کے

اسفند میں واقعی ہی زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ اس کی سرخ و سفید رنگت سنولا چکی تھی۔ وہ مسکراہٹ جو ہر وقت اس کے لبوں پر رقصاں رہتی تھی۔ اب کہیں بھی اس کا وجود نہیں تھا۔ اس کے ماتھے پر کئی لکیروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ کنپٹیوں پر جا بجا سفید بال نظر آ رہے تھے۔ بھنچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ وہ جوتے کے تسمے کھول رہا تھا۔ مومل اس پر نظریں جمائے رہی۔ اسفند کو شاید اچانک ہی ان نظروں کا احساس ہوا تھا۔ اس نے یک دم سر اٹھایا۔ مومل کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے اضطراب سے دیکھتا رہا پھر دوبارہ جوتے اتارنے لگا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ وہ جوتے اتار کر کھڑا ہو گیا اور بیلٹ اتارنے لگا پھر اس نے رسٹ واچ اتار کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

ایک بار پھر اس نے مومل کو دیکھا تھا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ مسلسل اسے دیکھ رہی ہے اس نے ایک بار پھر مومل کے چہرے سے نظر ہٹائی اس نے اسفند کے چہرے پر بے چینی کے آثار دیکھے۔ وہ کھڑا ہو کر سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ وہ پانی کا دوسرا گھونٹ پی رہا تھا جب اس نے مومل کی آواز سنی۔

”اسفند حسن! میں نے تمہیں تمہارے گناہ کے لیے معاف کیا اور میں خدا سے دعا کروں گی کہ وہ ...... وہ بھی تمہیں معاف کر دے۔“

گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ دس سال پہلے ضمیر نے جو خنجر اس کے سینے میں گاڑ دیا تھا۔ دس سال بعد دو جملوں نے اس خنجر کو نکال دیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنی زندگی کے سب سے مشکل لفظ دوہرا رہی تھی۔ لیکن خنجر اس کے سینے میں بہت گہرا گھاؤ چھوڑ گیا تھا جسے مندمل ہونے میں بہت وقت لگنا تھا اور جس کا نشان تو ساری عمر ہی رہنا تھا۔ وہ اب آنکھیں کھولے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو پونچھ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب چلا آیا۔ صوفہ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے مومل کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”میں تمہارا گناہ گار تھا۔ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ کوئی چیز اس پچھتاوے کو ختم نہیں کر سکتی جس کے ساتھ مجھے ہمیشہ رہنا ہے پھر بھی مومل! پھر بھی دعا کرو کہ یہ سب میری بیٹی کے ساتھ کبھی نہ ہو۔ میری زاشی کو کبھی کچھ نہ ہو۔“

مومل نے سینتیس سالہ اس مرد کو اپنے سامنے سر جھکائے ہاتھ جوڑے بچوں کی طرح بلکتے ہوئے دیکھا۔ اسے یاد آیا تھا۔ دس سال پہلے اس رات اس نے کہا تھا۔

"لیکن میں اپنی غلطی پر کبھی شرمندہ ہوں گا نہ تمہارے سامنے ہاتھ جوڑوں گا۔"

اور اب ...... اب وہ گڑگڑا رہا تھا۔ لرزتے ہوئے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس نے اسفند کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔

"کوئی چیز اس اذیت کو کم نہیں کر سکتی۔ اس ذلت کو مٹا نہیں سکتی جو تم نے دس سال پہلے میرے ماتھے پر لگا دی لیکن میں ...... میں سب کچھ بھول کر ایک بار پھر سے اپنی زندگی شروع کرنا چاہتی ہوں۔ ایک بار پھر سے دیکھنا چاہتی ہوں کہ دنیا میں میرے لیے کیا ہے۔ ایک بار پھر سے اپنی مٹھی میں خواہشوں کی کچھ تتلیاں پکڑنا چاہتی ہوں اور پھر شاید ...... شاید میں تمہارے اور زاشی کے حوالے سے کوئی خواب دیکھنے لگوں۔"

دس سال میں پہلی دفعہ اس نے جو سوچا تھا۔ وہ کہا نہیں تھا۔ وہ بس خاموش رہی تھی۔ کمرے میں پھیلی ہوئی روشنی کھڑکی سے نظر آنے والی تاریکی کو روشن کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور تاریکی میں سے بہت کچھ نظر آنے لگا تھا۔ جو دھندلا تھا اسے تو ہمیشہ دھندلا ہی رہنا تھا۔

آج اور کل

ڈیئر ایڈیٹر!

میرا نام مونا اشعر ہے اس سال میں نے اردو میں M.A کیا ہے۔ آپ کے ڈائجسٹ کو میں پچھلے کئی سالوں سے پڑھتی آ رہی ہوں بلکہ یوں سمجھیے ...... کہ آپ کے ڈائجسٹ اور میں نے جوانی کا سفر ساتھ ساتھ طے کیا ہے۔ آپ کے شمارے میں ہمیشہ ایسی کہانیاں شائع ہوتی ہیں جو مجھے پسند آتی ہیں مگر میں نے کبھی بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی مگر اس ماہ آپ کے رسالے میں ایک کہانی اور ایک رائٹر نے مجھے چونکا کر رکھ دیا اور مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ کہانی "میرے دل کی جنت" ہے۔ میں دعوے سے کہتی ہوں کہ میں نے آج تک اتنا پر تاثر ناول نہیں پڑھا۔ اسے پڑھتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھ پر سحر کر دیا ہو۔ ہر لفظ خوبصورت' ہر جملہ یادگار تھا۔ یوں جیسے قلم سے نہیں دل سے تحریر کیا گیا ہو۔ ہادیہ نذیر نے پہلی بار آ کر مجھے اس طرح مسحور کیا ہے کہ اب وہ میری پسندیدہ مصنفہ بن گئی ہیں۔ آپ میری جانب سے انہیں بہت بہت مبارکباد پہنچا دیں۔ امید کرتی ہوں' اگلے ماہ بھی ایسا ہی کوئی ناول پیش کر کے ہمارا دل جیت لیں گی۔

❁

ڈیئر ایڈیٹر!

اس ماہ کا ڈائجسٹ کچھ تاخیر سے ملا مگر اس تاخیر سے ہونے والی کوفت کو ہادیہ نذیر کے شان دار ناول نے مٹا دیا۔ آپ یقین کریں کہ میں نے رسالہ ملتے ہی سب سے پہلے ان کا ناول پڑھا تھا۔ بے شک یہ ہادیہ آپی کی ایک بہت دلکش تحریر تھی۔ اسے آپ کے ڈائجسٹ کی جان کہا جا سکتا ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہتی ہوں کہ اس کے علاوہ اس ماہ کے ڈائجسٹ میں اور کچھ بھی پڑھنے کے قابل نہیں تھا۔ ہادیہ باجی واقعی قلم سے انصاف کر سکتی ہیں۔ ان کا یہ ناول پچھلے ناول سے بالکل مختلف تھا اور یہ چیز ایک کامیاب اچھی رائٹر کی نشانی ہوتی ہے کہ اس کی ہر تحریر دوسری سے مختلف ہو۔ ان کے اس ناول کی خاص بات ان کی کردار نگاری ہے۔ بہت کم رائٹرز کے پاس یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ایسے کردار اپنی تحریر کے ذریعے پیش کریں جو پڑھنے والوں کے لیے جیتے جاگتے بن جائیں۔ ان کی تحریر کی ایک خاص بات وہ بے ساختہ پن ہے جو ان کے جملوں میں نظر آتا ہے۔ مجھے ایسی روانی اور ایسا بے ساختہ پن آج تک کسی دوسرے رائٹر کی تحریر میں نظر نہیں آیا۔ آپ ہادیہ آپی تک ایک بار پھر میری مبارکباد پہنچا دیں اور انہیں کہیں کہ وہ اسی طرح کی تحریریں لکھ کر ہمارے دل پر حکمرانی کرتی رہیں۔

☆

❁

ڈیئر ایڈیٹر!

اس ماہ کا ڈائجسٹ حسب توقع بہت جاندار یعنی شاندار افسانے لیے ہوئے تھا۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی مگر یوں لگتا ہے جیسے ہادیہ نذیر کے ہاتھ میں کوئی جادو ہے۔ وہ جب بھی لکھتی ہیں، جو بھی لکھتی ہیں دل میں اتر جاتا ہے۔ اس بار ایک بار پھر انہوں نے اپنی تحریر کی ایک ایک سطر سے چونکایا۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ وہ اتنے چونکا دینے والے واقعات کہاں سے اخذ کرتی ہیں۔ بعض دفعہ تو وہ ہمیں کسی دوسری دنیا سے آئی ہوئی مخلوق لگتی ہیں جو اپنی تحریر کی کرنوں سے ہمارے دلوں کو جگمگا رہی ہیں۔ اس بار بھی ''روشن رات'' نے ہم پر کچھ ایسا ہی جادو کیا کہ ہم کچھ اور نہیں پڑھ سکے۔ یہ کہنا بالکل غلط نہیں ہوگا کہ اب ہم ہادیہ نذیر کا نام دیکھ کر ڈائجسٹ خریدتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جو پختگی اور گہرائی ہوتی ہے وہ کسی دوسرے رائٹر کی تحریر میں نہیں ہوتی۔ یہ صرف ان کی تحریروں کی وجہ سے ہے کہ میں اب ہر ماہ آپ کو خط لکھنے پر مجبور ہو جاتی ہوں کیونکہ ایسی عمدہ تحریروں کی داد نہ دینا بڑی ستم ظریفی کی بات ہوگی۔ امید کرتی ہوں اگلے ماہ بھی ان کی کوئی ایسی ہی شاندار تحریر آپ کے ڈائجسٹ کی زینت بنے گی۔

☆

ڈیئر ایڈیٹر!

سب سے پہلے تو آپ کو ڈائجسٹ کی سالگرہ کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ خدا کرے کہ آپ کا بلکہ ہمارا ڈائجسٹ یوں ہی جگمگاتا رہے۔ ہر کہانی خوبصورت تھی مگر جس چیز نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہادیہ آپی کا ''نشانِ سفر'' ہے۔ ان کے اس ناول نے تو مجھے زاروقطار رلا دیا۔ پتا نہیں ہادیہ آپی کے ہاتھ میں کیا جادو ہے کہ وہ جو بھی لکھتی ہیں ہمارے دل میں اتر جاتا ہے۔ ان کا یہ ناول پڑھ کر میرا دل چاہا میں ان کے ہاتھ چوم لوں۔ انہوں نے اس بار اتنی خوبصورتی اور مہارت سے اس ناول کا اختتام کیا کہ کہیں بھی تشنگی باقی نہیں رہی۔ آپ یقین کریں کہ ایک طویل عرصے کے بعد مجھے ایسی تحریر پڑھنے کو ملی ہے جسے پڑھ کر میں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی ہوں۔ ہادیہ آپی کے لکھنے کا اسٹائل بہت زبردست ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ انہوں نے ابھی ابھی لکھنا شروع کیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ صدیوں سے لکھ رہی ہیں۔ جتنی جلدی انہیں شہرت ملی ہے' اتنی شہرت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچائے' (آمین۔) آپ ایک بار پھر میری طرف سے انہیں ڈھیروں مبارکباد پہنچا دیں۔

☆

ڈیئر ایڈیٹر!

آپ کے ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ موصول ہوا اور کہانیوں کی فہرست دیکھتے ہی ہمیں جھٹکا لگا۔ اس میں ہادیہ نذیر کا نام نہیں تھا۔ میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کس قدر مایوسی ہوئی کیونکہ پچھلے کچھ ماہ سے ان کی تحریریں پڑھ کر میں ہر ماہ ڈائجسٹ میں ان کی تحریروں کی عادی ہو گئی ہوں۔ اس ماہ پہلی بار وہ غیر حاضر رہی ہیں اور میرے لیے تو جیسے چراغوں میں روشنی نہیں رہی۔ بڑی بے دلی کے ساتھ میں نے سارا رسالہ پڑھا۔ رسالے میں کچھ بھی خاص نہیں لگا۔ کوئی تحریر ہمارے ملال کو کم نہیں کر سکی۔ ہادیہ جی نے ابھی چند ماہ پہلے ہی لکھنا شروع کیا ہے مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے انہیں لکھتے ہوئے اور مجھے ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ اب اس ماہ یک دم جو وہ رسالہ سے غائب ہوئی ہیں تو میری بے چینی اور بے تابی بہت بڑھ گئی ہے۔ ہادیہ جی آپ سے گزارش ہے کہ آپ ہر ماہ ڈائجسٹ میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا کریں۔ جو آپ سے محبت کرتے ہیں' ان کا خیال رکھنا آپ پر لازم ہے۔ امید ہے اگلے ماہ آپ اس ماہ کی طرح ڈائجسٹ سے غائب نہیں ہوں گی۔

☆

ڈیئر ایڈیٹر!

اس ماہ کا شمارہ نو تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل دیکھ کر ہی دل باغ باغ ہو گیا کیونکہ ہادیہ نذیر میری فیورٹ رائٹر ہیں اور ٹائٹل پر ہی ہمیں یہ خبر مل گئی تھی کہ اس بار ان کا مکمل ناول اس ماہ کی خصوصی پیشکش کے طور پر خواتین ڈائجسٹ میں شامل ہے۔ ڈائجسٹ کے لیے ہادیہ نذیر ایک خاص اور نایاب تحفہ ہیں۔ ان کی ہر تحریر دل میں اتر جاتی ہے۔ اس بار بھی ان کا ناول ''شامِ غم'' پورے رسالے کی جان تھا۔ یہ مکمل ناول خوشی و غم کا حسین امتزاج اور انوکھا پن لیے ہوئے تھا۔ انہوں نے دل و دماغ کو ایسا جھنجوڑا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ ''شامِ غم'' کو پڑھ کر مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ پھر کچھ پڑھنا ممکن ہی نہیں رہا۔ یہ ناول لکھ کر انہوں نے اپنے ادبی قد و قامت میں کچھ اور اضافہ کر لیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پچھلے ماہ کی غیر حاضری کی تلافی کر دی ہے۔ میری آپ سے فرمائش ہے کہ آپ جلدی اپنے رسالے میں ہادیہ نذیر کا تفصیلی انٹرویو اور تصویریں شائع کریں تا کہ ہم اپنی فیورٹ رائٹر کے بارے میں کچھ مزید جان سکیں۔ میری اور میری دوستوں کی طرف سے ہادیہ نذیر کو ان کے مکمل ناول پر بہت بہت مبارکباد۔

☆

ڈیئر ایڈیٹر!

ڈائجسٹ میں پچھلے سال شائع ہونے والی تحریروں کے بارے میں سروے کے لیے میں بھی آپ کو اپنی رائے سے آگاہ کر رہی ہوں۔ اگرچہ اس سال خواتین ڈائجسٹ میں بہت سے نئے نام ابھر کر آئے لیکن اگر کسی ایک رائٹر کا نام لیا جائے تو بلاشبہ وہ رائٹر ہادیہ نذیر ہی ہیں۔ جتنی ورائٹی انہوں نے اپنی تحریروں میں دی ہے وہ کسی دوسری رائٹر کی تحریروں میں نظر نہیں آئی۔ ان کا اندازِ تحریر، حالات و واقعات پر مکمل گرفت اور تسلسل، خوبصورت اور اچھوتا موضوع، انسانی جذبات و احساسات کا موثر بیان، پاورفل کردار یہ سب چیزیں مل کر ایسا سحر طاری کر دیتی ہیں کہ ہم خود کو ان کی کہانیوں کے ماحول کا حصہ تصور کرتے ہیں اور کہانی کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اتنی خوبصورت دل موہ لینے والی اور مضبوط و رواں تحریروں کو ناقابلِ فراموش کہا جانا زیادہ مناسب ہو گا۔ بلاشبہ اس پورے سال میں انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں کے دلوں پہ اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ ایک منجھی ہوئی رائٹر کی طرح انہوں نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو ہماری یادداشت کا حصہ بن گئی ہیں۔ یہ سال بلاشبہ ہادیہ نذیر کا سال رہا ہے اور اگلا سال بھی ان ہی کا سال ہو گا۔

☆

ڈیئر ایڈیٹر!

اس ماہ کا شمارہ خلاف توقع بہت جلدی مل گیا۔ سب سے پہلے ناموں کی فہرست پر نظر دوڑائی اور حسب عادت ہادیہ نذیر کا نام موجود پاتے ہی ان کی کہانی کھول کر بیٹھ گئے مگر پہلی بار مایوسی سے واپس لوٹے۔ یقین ہی نہیں آیا کہ یہ میری فیورٹ رائٹر کی تحریر ہے۔ سابقہ شاندار تحریروں روشن رات، دل کی جنت، شام غم، نشان سفر جیسی یادگار تحریروں والی کوئی بات اس میں نہ تھی۔ ہر چیز پھیکی تھی۔ مجھے ذرا بھی پسند نہیں آئی اور نہ ہی یہ سمجھ پائی کہ اس تحریر میں وہ کیا بتانا چاہ رہی تھیں۔ بہرحال انہوں نے پہلی بار ایسی عام سی تحریر پیش کی ہے۔ امید ہے وہ اگلی بار اپنے سابقہ معیار کو برقرار رکھتے ہوئے کوئی بہت ہی اچھی تحریر پیش کریں گی۔ اس بار تقریباً سارا شمارہ ہی اچھا تھا۔ ہادیہ نذیر کی تحریر کے علاوہ باقی تمام تحریریں دلچسپ تھیں۔ پڑھتے ہوئے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ہم نے مسلسل چھ گھنٹے تک رسالے کو پڑھ کر ہی دم لیا۔ آپ سے گزارش ہے کہ رسالہ میں کچھ نئی رائٹرز کی تحریروں کو بھی جگہ دیا کریں تا کہ ڈائجسٹ میں کوئی نئی بات دیکھنے کو ملے۔

☆

ڈیئر ایڈیٹر!

خواتین ڈائجسٹ جوں ہی ملا، ہم نے ہادیہ نذیر کی تحریر ڈھونڈ کر پڑھنا شروع کر دیا اور پہلی بار مکمل طور پر بور ہوئے۔ کئی صفحے ہم نے بنا پڑھے پلٹ دیے۔ ان کی تحریر میں وہ پہلے جیسی انفرادیت نہیں تھی جو ان کی تحریر کا خاصا تھی۔ انہیں کہیں کہ وہ اپنی تحریر کا معیار بہتر بنانے پر محنت کریں۔ اس بار نوشابہ ملک کی تحریر باقی تحریروں سے بہتر رہی۔ ان کا پلاٹ تو مضبوط تھا ہی لیکن ان کی کردار نگاری بھی بہت شاندار تھی۔ باقی کہانیوں کا معیار بھی بہت بہتر تھا۔ خاص طور پر سلمیٰ رانی، عائشہ علی اور ثمینہ محمود نے بہت متاثر کیا۔ باقی تمام سلسلے بھی پچھلی دفعہ کی نسبت خاصے بہتر تھے۔ دسترخوان کے سلسلے میں بھی اس بار ڈشز کافی بہتر تھیں۔ امید ہے کہ آپ خواتین ڈائجسٹ میں اگلے چند ماہ میں کچھ اور اچھی تبدیلیاں لائیں گی۔ خاص طور پر شعر و شاعری والے حصے میں طویل ناول چھاپنے کے بجائے آپ شعر و شاعری کے صفحات میں اضافہ کر دیں اور ہادیہ جی سے درخواست ہے کہ وہ بہت طویل کہانیاں نہ لکھا کریں۔ مختصر اور اچھا لکھا کریں۔ امید ہے اگلی بار وہ اپنی کہانیوں پر چھائے ہوئے جمود کو توڑ دیں گے۔

☆

ڈیئر ایڈیٹر!

اس ماہ ڈائجسٹ کا شمارہ حسب معمول تاخیر سے ملا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں مگر جس کہانی نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا' وہ نئی رائٹر سمیرا احمر کی کہانی ہے۔ میں دعوے سے کہتی ہوں کہ میں نے آج تک ایسا پر تاثر ناول نہیں پڑھا۔ اس کہانی نے مجھے چونکا کر کے رکھ دیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھ پر سحر کر دیا ہو۔ ہر لفظ خوبصورت' ہر جملہ یادگار تھا یوں جیسے قلم سے نہیں دل سے تحریر کیا گیا ہو۔ سمیرا احمر نے پہلی بار آ کر مجھے اس طرح مسحور کیا ہے کہ اب وہ میری فیورٹ رائٹر بن گئی ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ میری طرف سے اتنی شاندار اور منفرد تحریر پیش کرنے پر انہیں بہت بہت مبارکباد پہنچا دیں۔ ان سے پہلے کسی رائٹر نے ہمیں اس طرح متاثر نہیں کیا' نہ ہی پہلے کبھی کوئی تحریر مجھے ان کی تحریر کی طرح منفرد لگی ہے۔ آنے والا سال یقیناً سمیرا احمر کا سال ہو گا۔ امید ہے اگلے ماہ بھی وہ ایسا ہی کوئی شاندار ناول تحریر کر کے ہمارا دل جیت لیں گی۔

☆